فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	روشن مستقبل کے لئے محنت وکوشش شرط	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	فکری زاویے	مدیر	
		اسلامی دارالقضا اور ہندستان		۳
		ہجرت کا پیام انقلاب		۸
		آج کا منافق میڈیا		۱۲
		لوگ حلب کو بھول گئے مگر اردوغان.....		۱۵
۳۔	خاص تحریر	گاہ گدڑی میں لعل ہوتے ہیں	محمد خالد ضیا صدیقی ندوی	۲۰
۴۔	پیام سیرت	محبت کا امتحان	محمد فرید حبیب ندوی	۲۵
۵۔	نقد و نظر	دینی مدارس کی تعلیم عصر حاضر میں.....	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۲۷
۶۔	خصائص و امتیازات	امت محمدیہ، خصوصیات وامتیازات (قسط-۸)	محمد قمر الزماں ندوی	۳۷
۷۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۸)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴۳
۸۔	نقد و نظر	مسجد اقصی کے سلسلہ میں.....	محمد غزالی ندوی	۴۷
۹۔	ادبی تنقید	نغمہ ونور (قسط-۲)	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۵۲
۱۰۔	تعارف وتبصرہ	کتب جدیدہ	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۵۶
۱۱۔	آخری صفحہ	ہندستانی مسلمانوں کا مستقبل	م۔ق۔ن۔	۶۳
۱۲۔	شعر و ادب	غزل	عامر عثمانیؒ	

❁❁❁

اداریہ

فکری زاویے

اسلامی دارالقضااور ہندستان:

اسلام ایک مکمل دین ہے، اس کی حکومت خلوتوں پر بھی ہے اور جلوتوں پر بھی، انسانی زندگی کا کوئی حال اس سے خالی نہیں کہ جس میں اسلام کی رہنمائی نہ ملتی ہو، شرعی قوانین اس کی رہنمائی کے لیے موجود نہ ہوں، یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم نے شریعت کو پس پشت ڈال دیا، ظاہر ہے کہ ہم ہندوستان جیسے دارالعہد میں رہتے ہیں، یہاں کی اپنی مجبوریاں ہیں، فقہی طور پر بہت سی گنجائشیں موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود ذرا غور کیجئے کہ قرآن مجید کے کتنے حصہ پر ہم عمل پیرا ہیں اور کتنے حصہ پر نہیں، کیا قرآن مجید کے جس قدر حصہ پر اور اس کی جتنی تعلیمات پر ہم عمل کر سکتے ہیں اس پر ہمارا عمل ہے، پھر ذرا بلاد اسلامیہ میں موجود طاغوت کے مظاہر پر نظر ڈالیے، تباہی کے مناظر پر غور کیجئے اور بتایئے کہ کیا طاغوت کی حکمرانی اور طاغوتی قانون کی بالادستی کے ساتھ ان کتنم مومنین کی شرط پوری ہورہی ہے، جب یہ شرط ہی نہیں پوری ہوگی تو و أنتم الأعلون کا وعدہ کس طرح اور کیوں کر پورا ہوگا، عملی انحرافات کی مثالیں صاف نظر آتی ہیں، کہیں بالقصد اور کہیں مجبوری اس کا سبب ہے، بلکہ اب تو فکری انحراف بھی بالکل صاف نظر آتا ہے، اسلامی تعلیمات کا بڑا حصہ لوگوں کے ذہن سے غائب ہے، کہیں احساس کمتری، کہیں مرعوبیت اور کہیں طاغوتی قانون کی بالادستی اس کا سبب ہے۔

آج ہمارا معاشرہ مکمل طور پر غیر اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہے، شادی بیاہ سے لے کر نکاح وطلاق اور معاشرت ومعاملات میں غیر شرعی رسوم ورواج کا دور دورہ ہے، ہمارے باہمی معاملات اور آپسی تنازعات سے عدالتیں پٹی پڑی ہیں، وہ عدالتیں جہاں خدا کا قانون نہیں چلتا، بلکہ وہ خدائی قانون سے واقف بھی نہیں اور خدا کے قانون کی منکر بھی ہیں، اس صورت میں مسلمانوں کا ان عدالتوں میں فیصلے لے جانا کیوں کر درست ہوسکتا ہے، چہ جائیکہ خالص مذہبی اور ملی مسائل کے لئے دیندار لوگ ان طاغوتی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹائیں، یقیناً یہ عذر پیش کیا جاسکتا ہے کہ ہم ہندوستان میں ہیں، یہاں اسلامی حکومت نہیں، تو قانون وفیصلہ کے نفاذ کی ذمہ داری کس کی ہوگی، دو فریق جو مسلمان ہوں انہیں اس قدر باشعور ہونا چاہیے، اور بنانا چاہیے کہ وہ اپنے ہر تنازعہ اور قضیہ میں خواہ قضیہ عقیدہ، معاشرت، معاملات کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق ہو، "فیما شجر بینھم" میں سب داخل ہے، شریعت سے رجوع کریں اور شریعت کے فیصلہ کو تسلیم کریں، اگر ایسا نہیں ہے تو ہندوستان جیسے ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں اور حکومت اسلامی نہ ہو، وہاں اس بات کا جواز ہے کہ دنیا کی طاغوتی عدالتوں میں بغرض انصاف جایا

جائے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکثر ان عدالتوں میں جانے کا بڑا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنی غلطی کو جانتے ہوئے محض اس لیے جاتے ہیں کہ وہاں سے کسی طرح ناحق فیصلے حاصل کیے جائیں، منافقین کی یہ عام روش بیان کی گئی ہے کہ جس مقدمہ میں ان کو خدشہ ہوتا کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا اسے لے کر وہ محمد ﷺ کے پاس جاتے اور جس مسئلہ میں انہیں اپنے ناحق ہونے کا یقین ہوتا اس کو وہ رسولؐ کے پاس لانے سے انکار کر دیتے اور طاغوتی عدالتوں سے رجوع کرتے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ ہم کس قدر اپنے ذاتی اور باہمی معاملات میں شریعت کی حکمرانی تسلیم کرتے ہیں، بالخصوص وہ لوگ غور کریں جو اپنے مومن ہونے کے دعویدار ہیں، اور ایسی صورت میں مزید شدت کے ساتھ غور کرنا چاہیے کہ جب دو فریق ہوں اور دونوں حامل شریعت اور عالم علوم شریعت ہوں پھر بھی وہ اسلام کے نظام قضا سے رجوع نہ ہو کر، شریعت کا حکم نہ معلوم کر کے طاغوتی عدالتوں کے چکر کاٹیں، ظاہر ہے اس صورت میں پہلا شخص ناحق ہونے کی صورت میں اصل مجرم ہوگا، کیوں کہ وہ ناحق ہوتے ہوئے گیا جبکہ دوسرا تو اس کی وجہ سے اب جانے پر مجبور ہوا، لیکن اگر پہلا حق پر ہے اور دوسرا ناحق ہے، تو پہلے کے جانے کی وجہ اگر یہ ہے کہ دوسرا فریق بغیر عدالتی چارہ جوئی کے حق تسلیم کرنے کو تیار نہیں تو اس صورت میں یہ دوسرا فریق اصل مجرم ہے، خداوند قدوس کا ارشاد عالی ہے **فلا وربك لا يومنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا فى انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما (نساء ٦٥)**۔

آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، فرمایا جا رہا ہے کہ اے محمد! آپ کے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ اپنے باہمی معاملات میں تم کو حکم و فیصل نہ مان لیں اور پھر آپ جو فیصلہ فرما دیں اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ آپ کے فیصلہ پر سر تسلیم خم نہ کر دیں، غور کیجئے **ويسلموا تسليما** کہا گیا ہے، سر بسر تسلیم کر لیں، عملی غفلت و کوتاہی اور شریعت کی خلاف ورزی اور چیز ہے لیکن ناحق کے حصول کے لیے، بالقصد اور بسا اوقات فریقین کے علم شریعت سے واقف ہونے کے باوجود طاغوت کی عدالت میں حاضری اور چیز ہے، ظاہر ہے کہ یہ حکم خداوندی حضورؐ کی حیات مبارکہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تا قیامت آپؐ کے ہر ثابت شدہ عمل کو ماننے یا نہ ماننے پر مومن ہونے اور نہ ہونے کا انحصار ہے، آپؐ کی حیات میں بلا واسطہ آپ سے رجوع کرنے کا حکم تھا اور آپ کے بعد آپؐ کی شریعت سے رجوع کرنے کا حکم ہے، حکم شریعت ہی درحقیقت حکم رسول ہے، حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ جس شخص کو قرآن پہنچ گیا وہ ایسا ہو گیا جیسے اس نے محمد ﷺ کی زیارت کر لی، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو قرآن پہنچ گیا میں اس کا نذیر ہوں، اس لحاظ سے یہ حکم تا قیامت جاری و ساری رہے گا، اسی کو تو اس حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے **لا يومن احدكم حتى يكون هواه تبعا لما جئت به** گویا جان بوجھ کر، بدون عذر اپنے مقدمات میں شریعت کے علاوہ کسی کو فیصل و حکم بنانا حاکمیت الہ کے ساتھ حضورؐ کی قانونی اور تشریعی حیثیت کا انکار ہے، خداوند قدوس نے بے شمار آیات میں حضورؐ کی اطاعت کا حکم دینے کے ساتھ اس آیت کریمہ میں قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جو رسول کے فیصلہ کو کھلے دل سے قبول نہ کرے وہ مومن نہیں، منافق ہے، مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''اول یہ کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو اپنے ہر جھگڑے اور ہر مقدمہ میں رسول کریم ﷺ کے فیصلہ پر مطمئن نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے اس شخص کو قتل کر ڈالا جو آنحضرت ﷺ کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور پھر معاملہ کو حضرت عمرؓ کے پاس لے گیا، اس مقتول کے اولیاء نے رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں حضرت عمرؓ پر دعویٰ کر دیا کہ انہوں نے ایک مسلمان کو بلا وجہ قتل کر دیا، جب یہ استغاثہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ہوا تو بیساختہ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا: ما کنت اظن ان عمر یجترءُ علی قتل رجل مؤمن (یعنی مجھے یہ گمان نہ تھا کہ عمر کسی مرد مومن کے قتل کی جرأت کریں گے) اس سے ثابت ہوا کہ حاکم اعلیٰ کے پاس اگر کسی ماتحت حاکم کے فیصلہ کی اپیل کی جائے تو اس کو اپنے حاکم ماتحت کی جانب داری کے بجائے انصاف کا فیصلہ کرنا چاہیے، جیسا اس واقعہ میں آیت نازل ہونے سے پہلے آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر اظہار ناراضی فرمایا، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو حقیقت کھل گئی کہ اس آیت کی رو سے وہ شخص مؤمن ہی نہیں تھا۔

دوسرا مسئلہ اس آیت سے یہ نکلا کہ لفظ فیما شجر صرف معاملات اور حقوق کے ساتھ متعلق نہیں، عقائد اور نظریات اور دوسرے نظری مسائل کو بھی حاوی ہے، (بحر محیط) اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جب بھی کسی مسئلہ میں باہم اختلاف کی نوبت آئے تو باہم جھگڑتے رہنے کے بجائے دونوں فریق رسول اللہ ﷺ کی طرف اور آپؐ کے بعد آپ کی شریعت کی طرف رجوع کر کے مسئلہ کا حل تلاش کریں۔'' (معارف القرآن ج ا ص ۱۱۲-۱۱۳)۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ اس سے پہلے کی آیات پر نظر ڈالی جائے: الم تر الی الذین یزعمون انهم آمنوا بما انزل الیك وما انزل من قبلك یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا به، ویرید الشیطان ان یضلهم ضلٰلا بعیدا۔ واذا قیل لهم تعالوا الی ما انزل الله والی الرسول رأیت المنافقین یصدون عنك صدودا۔ (سورة النساء، آیت ۶۰، ۶۱)۔

(ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جو دعوے کرتے ہیں کہ جو کچھ آپ پر نازل ہوا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا، وہ اسے مانتے ہیں، اور چاہتے یہ ہیں کہ طاغوت (جاہلانہ اور کافرانہ نظام) کی طرف اپنے مقدمات میں رجوع کریں، جبکہ حکم یہ ہے کہ ان کا انکار کیا جائے، اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ ان کو بھٹکا کر دور نکال دے۔ ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کے نازل کردہ (قانون) کی طرف اور رسول کی طرف (یعنی انہیں اسلامی عدالتوں اور قرآن وحدیث کی بنیاد پر فیصلوں کی طرف دعوت دی جاتی ہے) تو آپ ان منافقین کو دیکھیں گے کہ یہ آپ سے کترا کر نکل جائیں گے۔)۔

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کے ضمن میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ بشر نامی ایک منافق کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا، یہودی نے کہا چل محمد ﷺ سے فیصلہ کرواتے ہیں، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ وہ حق پر ہے اور محمد ﷺ کی عدل پروری سے اس کو

اس کا حق ملے گا، اگر چہ اس کا مقابل منافق (بظاہر مسلمان) ہے، منافق بشر کو معلوم تھا کہ وہ حق پر نہیں ہے اس لئے اس نے کہا کہ کعب بن اشرف یہودی سے فیصلہ کراتے ہیں، اسی کو کہا گیا ہے کہ یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ یہودی حق پر تھا اس لیے اسے اپنے سردار کعب بن اشرف سے زیادہ حضورؐ کے عدل وانصاف پر اعتماد تھا، اور منافق غلطی پر تھا اس لئے جانتا تھا کہ حضور کا فیصلہ اس کے خلاف ہوگا، اس لیے وہ طاغوتی عدالت سے فیصلہ کرانے پر مصر تھا، قصہ مختصر دونوں میں باہمی گفتگو سے یہ طے پایا کہ حضورؐ سے فیصلہ کرائیں، حضور نے تحقیقات کے بعد یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا، منافق اس فیصلہ پر راضی نہ ہوا، اس نے ایک نئی ترکیب سوچی کہ حضرت عمرؓ کفار کے معاملہ میں بہت سخت ہیں اس لئے اگر اپنے فریق کو کسی طرح اس پر راضی کر لیا جائے کہ اس معاملہ کا فیصلہ وہ کریں تو میرا کام بن سکتا ہے، بہر حال یہودی کسی طرح اس پر بھی راضی ہو گیا اور معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچ گیا، یہودی نے ان کو سارا قصہ سنایا اور حضور کے فیصلہ سے باخبر کیا اور یہ بھی بتایا کہ یہ میرا فریق رسول کے فیصلہ سے مطمئن نہیں ہے، حضرت عمر نے منافق سے پوچھا یہی معاملہ ہے؟ اس نے تائید وتصدیق کی، فرمایا ذرا ٹھہرو، گھر کے اندر گئے اور تلوار لے کر آئے اور منافق کی گردن ماردی، اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص رسول کا فیصلہ نہ تسلیم کرے اس کا یہی فیصلہ ہے، متعدد مفسرین نے اس واقعہ کے بعد مقتول منافق کے وارثین کی طرف سے حضرت عمرؓ کے خلاف دعویٰ دائر کرنے کی تفصیل بھی لکھی ہے، کہ وارثوں نے یہ دعوی کیا کہ انہوں نے ایک مسلمان کو بغیر کسی دلیل شرعی کے قتل کرنے کا ارتکاب کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس شخص کے نفاق کی قلعی کھول کر حضرت عمر کو بری فرمادیا اور اس طرح اس کے وارثین کا دعوی خارج کر دیا گیا۔

ان آیات میں غور کرنے کے بعد جب اپنی حقیقت حال پر نظر جاتی ہے تو شک سا ہونے لگتا ہے، دیکھیے تو صحیح انداز قرآنی، اس شخص کو دیکھو جسے ایمان کا دعوی بھی ہے اور اپنے جھگڑوں، معاملات، نزاعات ونظریاتی اختلافات کا فیصلہ طاغوت کے پاس لے جانا چاہتا ہے، جبکہ اسے طاغوت کے انکار کا حکم دیا گیا تھا، لیکن کتاب وسنت کو ترک کر کے، طاغوت کی عدالت میں پہنچا کر شیطان نے اسے گمراہیوں کے گہرے دلدل میں پھنسا دیا۔

جب منافقین کی پول کھول دی گئی تو پھر حاضر خدمت ہو کر قسمیں کھانے لگے اور بے جا تاویلیں پیش کرنے لگے، شریعت کی موجودگی اور اس پر عمل کرنے کے مواقع موجود ہونے اور اس کے لیے حالات سازگار ہونے کے باوجود بھی اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو پھر یہ کسی طرح نفاق سے کم نہیں، اور اس پر بے سر پیر کی تاویل یا عذر لنگ قابل قبول نہیں، دیکھیے آگے قرآن مجید نے کس انداز میں بے جا تاویلوں کی حقیقت بیان کی ہے، شریعت ہے ہی اس لیے کہ اس پر عمل کیا جائے، رسول کی بعثت ہوئی ہی اس لیے کہ ان کا اتباع کیا جائے، پھر بھی طاغوت کی عدالت میں جاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ فیصلہ کا قانونی حق تو حضور کو ہی حاصل ہے مگر ہم تو دوسروں کے پاس اس لیے گئے کہ شاید فریقین کے لیے کوئی اچھا حل نکل آئے، بھلائی کا کوئی سرا ہاتھ آجائے فکیف إذا اصابتهم مصيبة بما قدمت ايديهم ثم جاء وك يحلفون بالله ان اردنا إلا احسانا وتوفيقا۔ اولئك الذين يعلم الله ما فى قلوبهم فاعرض عنهم وعظهم وقل لهم فى انفسهم قولا بليغا۔ (نساء آیت ۶۲۔۶۳)۔

(ترجمہ: پھر ان کا کیا حال ہوتا ہے، جب ان پر کوئی مصیبت اپنے کرتوتوں کی وجہ سے آتی ہے، تو یہ آپ سے آکر قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو بہتری اور آپس میں جوڑ کا تھا۔ ان لوگوں کے دلوں کا حال اللہ خوب جانتا ہے اس لئے ان سے گریز کیجئے اور انہیں نصیحت کیجئے اور ان سے ایسی بات کہیے جو ان کے دلوں تک پہنچ سکے)۔

اس آیت میں حضور کو ایسے دل و دماغ کے مریضوں سے جو عملا اور صراحتاً شریعت کی مخالفت بھی کریں اور پھر بیکار کی باتیں بنائیں، ان سے اعراض کرنے کے ساتھ موثر و دلپذیر انداز میں نصیحت کرنے کا حکم دیا گیا، کہ ان لوگوں کو حاکمیت الہ، شریعت کی بالادستی، رسول اللہ کی قانونی حیثیت اور جملہ اسلامی تعلیمات کو بلیغ و مؤثر انداز میں اس طرح سمجھایا جائے کہ وہ ان کے دلوں میں اتر سکے، وعظهم پر غور کیجئے، جو ذمہ داری رسول کی تھی وہ اب علوم نبوت کے وارثین وحاملین پر ہے، لہذا انہیں چاہیے کہ وہ اپنے قول و فعل اور کردار و عمل سے عام مسلمانوں کو اس طرح نصیحت کریں کہ وہ ملک میں موجود اسلامی نظام قضا سے رجوع کرنے کے عادی ہو جائیں، آپسی معاملات میں وہ قطعی طاغوتی طاقتوں کو حکم نہ بنائیں، اس طرح وہ جھوٹ، فریب اور ضیاع وقت کے ساتھ ساتھ ضیاع مال سے بھی بچیں گے اور ان آیات میں موجود وعیدوں سے بھی انہیں نجات حاصل ہوگی، راقم یہ سمجھتا ہے کہ وعظهم وقل لهم فی أنفسهم قولا بليغا میں اس طرح نصیحت کرنے کا مطالبہ ہے کہ بات دلوں میں اتر جائے، خواہ یہ سمجھا بجھا کر، ذاتی تجربہ پیش کرکے ہو، عملی کردار کا نمونہ پیش کرکے ہو جس طرح بھی ممکن ہو مؤثر انداز میں شریعت سے دور رہنے والوں کو شریعت کی بالادستی تسلیم کرنے کی نصیحت کی جائے، لحاظ رہے کہ حضورؐ کی سیرت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی عمل پر ابھارنے، نصیحت کے پھلنے اور تحریک کے پھیلنے میں عملی کردار کا بڑا دخل رہا ہے، چنانچہ ضرورت ہے کہ اسلامی دارالقضاء کے نظام کو مزید خوب تر وفعال بنایا جائے اور اپنے تنازعات کو وہاں حل کرا کر عملی نظیر پیش کی جائے، ان آیات میں غور کرنے کے بعد اس کا یہ احساس شدید تر ہو گیا کہ جو لوگ علوم شریعت کے حامل ہوں، قرآن وسنت کے علم کے دعویدار بلکہ سند یافتہ ہوں ان کا دارالعہد میں رہنے کے باوجود آپس میں، مذہبی، ملی، ادارتی بلکہ ذاتی معاملات میں شریعت کو چھوڑ کر دنیا کے قانون اور جھوٹ کا سہارا لینا وکیلوں پر پیسہ خرچ کرنا حرام نہیں حرام تر ہے۔ کیوں کہ یہاں تو یہ خطرہ ہی نہیں کہ فریق مخالف اگر فیصلہ سے راضی نہ ہوا تو پھر نافذ کون کرے گا، کیوں کہ دونوں حق وناحق اور حکم شریعت سے واقف ہیں، چہ جائیکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔

جن ممالک میں شریعت اسلام کے مطابق زندگی گزاری جاسکتی ہے اور شرعی نظام کے نفاذ کے تمام امکانات موجود ہیں وہاں اگر شریعت پر عمل نہیں تو پھر تاویلات کا جس قدر بھی سہارا لیجئے مگر قرآن کے الفاظ بہت صریح ہیں ومن يشاقق الرسول من بعد ماتبين له الهدىٰ ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ماتولى ونصله جنهم وساء ت مصيرا (نساء ۱۱۵) (ترجمہ: اور جو رسول سے کٹ کر اپنی ڈگر بنائے گا، جبکہ ہدایت اس کے سامنے کھل کر آچکی ہے، اور ایمان والوں کے راستہ سے ہٹ کر کوئی راستہ اپنائے گا، تو ہم اسے اسی رخ پر چلنے دیں گے، اور پھر جہنم میں جھلسا دیں گے، اور اس کا بہت برا انجام ہوگا۔)۔

جن ممالک میں مسلمانوں کے لیے اس قدر گنجائش موجود ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل کرسکیں وہاں

انہیں اپنے حدود میں رہتے ہوئے شریعت اسلامی کے دائرے کو وسعت دینی چاہیے، اسلامی نظام قضا، اسلامی نظام تعلیم، اسلامی نظام معاشرت اور اسلامی نظام تجارت پر اگر اس ملک کے مسلمان عمل کریں تو انہیں کون روک رہا ہے، اسلامی تعلیم تو ہے لیکن اسلامی نظام تعلیم بڑی حد تک مفقود، اسلامی دار القضا تو ہے مگر خود ہماری بے اعتنائی سے شاکی و معطل، ضرورت ہے کہ ان شعبوں کو فعال بنایا جائے اور قرآن کے ان تیوروں سے بھی لوگوں کو واقف کرایا جائے، اب صورت حال بایں جا رسید کہ عام لوگ جس نظام میں زندگی گزار رہے ہیں اس پر اس لیے راضی بہ رضا ہیں ہیں کہ وہ اسے اسلامی نظام نہیں تو ایسا نظام ضرور شمار کرتے ہیں جس سے اسلام راضی ہے۔

ہجرت کا پیام انقلاب:

محرم الحرام کی آمد ہے، نئے اسلامی سال کا آغاز ہے، جس کو ہجری سال بھی کہا جاتا ہے، نئے ہجری سال کے آغاز پر اگر ایک مسلمان کا ذہن تاریخ کے دریچوں سے ماضی میں جھانکنے لگے تو تعجب کیسا؟ ہجرت اسلامی تاریخ کا نقطۂ انقلاب ہے، ہجرت سے دعوت اسلامی کی تحریک کے تناور درخت میں تبدیل ہونے کا آغاز ہوتا ہے، ہجرت کے سبب ''مکہ کے کمزور مسلمانوں'' کو مدینہ منورہ کی شکل میں دار الاسلام کی وسیع و پر بہار فضا میسر آئی، ہجرت فتح مکہ سے قبل ایمان کی شرط تھی، ہجرت کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید نے کہا ہے، **إن الذين توفهم الملئكة ظالمى أنفسهم قالوا فيم كنتم قالوا كنا مستضعفين فى الأرض قالوا الم تكن ارض الله واسعة فتهاجروا فيها فاولئك ماواهم جهنم وساء ت مصيرا** (نساء ۹۷) (ترجمہ: جن لوگوں کی جان فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں، کہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں (اپنے دین وایمان کو گزند پہونچاتے ہیں) فرشتے ان سے کہتے ہیں: تم کس حال میں پڑے تھے، وہ کہتے ہیں کہ ملک میں (یا علاقہ) میں دبے کچلے کمزور تھے، تو وہ کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین وسیع وعریض نہیں ہے کہ تم یہ علاقہ چھوڑ کر (اپنے دین کے تحفظ کے لئے) کہیں اور بستے، اور ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا، اور بہت برا انجام ہوگا۔)

ہجرت کی جس قدر اہمیت تھی، اسی قدر وہ مشکل تھی، وطن عزیز کو چھوڑنا کوئی کھیل تماشہ نہ تھا، عزیز واقرباء، بچپن کی یادیں، مانوس گلیاں، جوانی کی دھوپ چھاؤں، ننھیال و ددھیال کی محبتیں، تجارتیں، گھر، زمین وجائیداد سب قربان کر دینا کوئی آسان کام نہ تھا، آج تو لوگ اس کی شدت وہولنا کی، وطن سے دوری کے درد، افراد خانہ اور رشتہ داروں کی خون رلانے والی یادیں زیادہ آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں، جب وہ سال دوسال کے لیے پردیس کسب معاش یعنی محض اپنی ضرورت کی خاطر عازم سفر ہوتے ہیں تو دماغ میں ہلچل ہوتی ہے، دل کی دنیا غیر ہوتی ہے، گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھنا کس قدر دشوار ہوتا ہے، ہجرت کس قدر مشکل تھی ذرا حبیب کبریا حضرت محمد ﷺ کے اس جملہ سے اندازہ کیجئے، جس جملہ سے فطرت انسانی اور قوت ایمانی کے ملے جلے جذبات کی صاف عکاسی ہو رہی ہے، آپؐ نے اپنے پیارے وطن مکہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا، **ما اطيبك من بلد و أحبك**

إلیّ ولولا أن قومی أخرجونی منك ما سكنت غیرك (ترمذی) اے وطن عزیز مکہ تو کتنا اچھا شہر اور مجھے کس قدر عزیز ومحبوب ہے، اگر میری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا اور کہیں سکونت نہ اختیار کرتا، غور کیجئے یہ بات آپؐ اس وقت فرمارہے ہیں جبکہ آپ کو اذن ہجرت ہو چکا ہے، اور آپؐ نے یہ خواب بھی دیکھا ہے کہ دار الہجرت ایک پُر باغ وبہار مقام ہے (بخاری)، آپ کا خیال تھا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا کوئی شہر ہوگا مگر یہ خوش نصیبی تو مدینہ کا مقدر تھی، اسی لیے بعض وہ مقامات بھی دار ہجرت نہ بن سکے جہاں کے لوگوں نے خود ہی آکر پیش کش کی کہ آپ ہمارے یہاں تشریف لائیے، بہر حال اس پورے پسِ منظر کے باوجود خود حضور اور صحابہ کو اس حکم الٰہی کو بجالانا پڑا جو انہیں یوں دیا گیا تھا یعبادی الذین آمنوا إن ارضی واسعة فایای فاعبدون (عنکبوت ۵۶) اور جس سے انحراف کرنے والوں کو "ظالمی انفسهم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ہجرت یقیناً بہت مشکل کام تھا، لیکن عقیدے وایمان کی حفاظت اس سے زیادہ ضروری تھی، دنیا کی ہر محبوب چیز کو، محبوب مقام ومکان کو، محبوب ترین اشخاص کو، ماں باپ اولاد سب کو عقیدہ وایمان کی حفاظت کے لیے قربان کرنا پڑے تو کوئی حرج نہیں، رسول خدا اور صحابہ نے یہ کر دکھایا، اس مشکل کو انجام دینے کے لئے انہیں بشارت دی گئی ومن یهاجر فی سبیل الله یجد فی الأرض مراغما كثیرا وسعة (نسا ۱۰۰) (ترجمہ: اور جو راہ خدا میں ہجرت کرتا ہے، اسے روئے زمین پر بہت سی پناہ گاہیں اور کشادہ جگہیں مل جاتی ہیں) اور ہوا بھی ایسا کہ ہجرت کے بعد ابتدائی دور میں تو مسلمان بڑی کسمپرسی کی حالت میں رہے، لیکن پھر اللہ نے بڑی کشائش اور گنجائش پیدا فرمادی، اس کے بعد جو صحابہ کرام کے فقر وفاقہ کے واقعات ملتے ہیں وہ ان کے اختیاری ہیں، ان کی زاہدانہ اور درویشانہ شان کے رموز ہیں، ام المومنین حضرت زینبؓ کی زندگی دیکھیے سرکاری وظیفہ ملتا تو اسے مساکین میں تقسیم فرمادیتی تھیں اسی لیے ان کا لقب ہی ام المساکین پڑ گیا، خود آپ کا فقر وزہد اختیاری تھا، آپؐ نے اپنے اختیاری زہد وفقر سے امت کو استغنا کی تعلیم دی، اس پر قرآن بھی شاہد ہے اور حدیث بھی۔

ہجرت واقعی بہت مشکل عمل تھا، لیکن اس کے نتائج بہت دور رس تھے، چنانچہ قریش مکہ نے مہاجرین کی راہ میں بے شمار روڑے اٹکائے، خود حضورؐ کے قتل پر اتفاق کرلیا، لیکن اخلاص وعزم کے آگے پہاڑ بھی نہیں ٹھہر پاتے، جب خدا پر بھروسہ کیا گیا اور اس کے حکم کی بجا آوری میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا گیا، بطور اسباب کے رات میں سفر اختیار کیا گیا اور تین دن غار میں پناہ لی گئی تو اس اخلاص وتوکل کے سبب مکڑیوں سے اللہ نے حفاظت کروائی، سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے، وہ بیٹھ کر پھر اٹھ نہ سکا، ہجرت یہی تو سکھاتی ہے کہ اخلاص، عزم، توکل اور اسباب اختیار کرنے کے ساتھ جب خدا کے حکم کو بجالانے کی ٹھان لی جائے تو پھر اللہ کی طرف سے فتح کے دروازے کھلتے ہیں۔

ہجرت کیا تھی؟ محض ایک شہر سے دوسرے شہرت کی طرف نقل مکانی نہ تھی، بلکہ یہ حالات کی تبدیلی کی تمہید تھی، تحریک دعوت اسلامی اپنے ابتدائی اور تنگ حالی کے دور سے نکل کر مثالی اور خوشحالی کے عہد میں قدم رکھ رہی تھی، ہجرت عظیم انقلاب کا نقطۂ آغاز تھی، ہجرت دعوت اسلامی کے عروج کی علامت بن گئی، ہجرت کے سبب قلت کثرت میں اور ضعف قوت میں تبدیل ہوگیا،

مسلمانوں کی بکھری قوت کو شوکت واجتماعیت نصیب ہوئی، اب جو تحریک محدود تھی، اس نے لامحدود دنیا کا سفر شروع کر دیا، ہجرت نے یہ ثابت کر دیا کہ اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے باوجود باطل کے لئے شکست مقدر ہے اور بہتر انجام کار نیکوکاروں کا حصہ ہے، ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مثالی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی، جہاں سے عدل پروری، کرم گستری، انسانیت نوازی کی کرنیں سارے عالم پر پڑیں، حریت ومساوات کا درس پوری دنیا کو دیا گیا، غلبۂ دین کا وعدۂ الٰہی پورا ہوا اور اسلامی نظام وریاست کا ایک مثالی نمونہ پیش کر دیا گیا۔

لغت کے اعتبار سے اگر ہجرت کسی چیز سے بیزار ہو کر اسے چھوڑ دینے کو کہتے ہیں تو یہ معنی بھی اس ہجرت میں موجود ہیں، صحابہ کرام نے اپنی پسند کی کس کس چیز کو خدا کے حکم کی خاطر نہیں چھوڑا، عرف عام میں ہجرت اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کو کہتے ہیں تو اس ہجرت میں بدرجہ اتم یہ معنی بھی پائے جاتے ہیں، اصطلاح شریعت میں ہجرت اگر دارالحرب سے دارالاسلام جانے کو کہتے ہیں تو یہ ہجرت تھی ہی مدینہ کو دارالاسلام بنا کر اسلام کی آبیاری کرنے کے لیے، اسی کا نتیجہ تھا کہ قیصر روم کی سلطنت عظمیٰ اسلام کے زیر اثر آئی، کسری فارس کی دہکائی ہوئی آگ ہمیشہ کے لیے بجھ گئی ___ یہ الگ بات کہ مجوسی نسل کے لوگ ہر زمانہ میں احیائے مجوسیت کی ادھیڑ بن میں لگے رہے اور خمینی انقلاب کے بعد تو یہ تحریک اس قدر تیز ہوئی کہ پورے عالم اسلام کے لیے دشمنان اسلام کا سب سے بڑا ہتھیار بن گئی ___ یہ سب کیوں نہ ہوتا؟ قرآن مجید نے مہاجرین کو بے پناہ بشارتوں سے نوازا ہے کہ کہیں ان کی تعریف میں فرمایا اولئك يرجون رحمة الله کہیں ان کے مقام بلند کی بابت فرمایا: ان الذين امنوا وهاجروا وجاهدوا فى سبيل الله باموالهم وانفسهم اعظم درجة عند الله واولئك هم الفائزون.

ظاہر ہے کہ ہجرت کا وہ مفہوم تو اب باقی نہیں رہا کہ اسلام کے اظہار کے لئے ہجرت شرط ہو، کیوں کہ جناب محمد رسول اللہؐ نے فتح کے بعد واضح الفاظ میں فرمادیا کہ لا هجرة بعد الفتح فتح مکہ کے بعد ہجرت کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے، لیکن یہ بات اس ماحول میں فرمائی جارہی تھی جس ماحول میں اسلام ایک ریاست بن گیا تھا، پورا جزیرۃ العرب اسلام کی آغوش میں آرہا تھا، غلبہ دین کا وعدہ الٰہی پورا ہو رہا تھا، اس فضا میں اور تاریخ کے اس موڑ پر واقعی ہجرت کے کیا معنی، لیکن قرآن مجید کی آیات جو قیامت تک کے لیے ہیں اور اس حدیث کا پس منظر یہ پیغام دیتا ہے، کہ دارالکفر میں یا دارالعہد میں رہتے ہوئے وہ محنت جاری رکھی جائے جو صحابہ کرام کی ہجرت کرنے والی جماعت نے مکہ میں کی تھی، دارالاسلام کے قیام اور غلبۂ دین کی تمنا اور اس کے لیے مطلوب کی عہد کو سامنے رکھتے ہوئے دعوتی جدوجہد ایمان کا وہ تقاضہ ہے جس سے غفلت قابل مواخذہ ہے، عمل کا مکلّف تو بقدر استطاعت بنایا گیا ہے لیکن اس ''قدر استطاعت'' سے بھی اعراض وغفلت اور اس حد تک کہ دینداروں کے ذہن سے بھی ہجرت وغلبہ دین کا مفہوم غائب ہو جائے، یہ نہ صرف قابل تعجب بلکہ سخت مواخذہ کا موجب ہے، کفر کی بالادستی میں مطمئن ہو کر بیٹھ جانا اہل ایمان کا شیوہ نہیں، اہل ایمان کا اسوہ یہ ہے کہ بقدر استطاعت عملی تحریک جاری رہے، کفر وشرک سے نفرت قلب میں جاگزیں ہو، حتی کہ یا موت آجائے یا دین غالب ہو جائے اور اگر کسی کو موقع ملے اور حالات سازگار ہوں تو کسی ایسے ملک کی طرف کوچ کر

جائے جو دارالاسلام کہلانے کا مستحق ہو۔

مختصر یہ کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت ایمان کی شرط تو نہ رہی مگر یہ حکم بایں طور تا قیامت باقی رہا کہ اگر ایمان وعقیدے کی حفاظت کے لئے کسی کو کسی مقام پر دشواری پیش آئے اور اس کے لیے ایسے مقام پر ہجرت کر جانے کے وسائل موجود ہوں جہاں بآسانی وہ اپنے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کر سکے اور شریعت پر عمل پیرا ہو سکے تو ضرور کرنا چاہیے۔

ہجرت کے جس مفہوم کے ہم سب ہمہ وقت مکلّف ہیں اور جس کا ہم سب سے مطالبہ ہے وہ اس حدیث سے مستفاد ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا المهاجر من هجر مانهى الله عنه ورسوله (بخاری ومسلم) مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے، یعنی ہجرت کے لغوی معنی جو اوپر مذکور ہوئے وہ مراد لیے گئے ہیں، اگر کفر سے بیزاری، شرک کے مظاہر سے نفرت، ہندوانہ رسوم ورواج سے اجتناب، محرمات سے بچنے کے ساتھ اوامر کی پابندی کی طرح ڈالی جائے اور اس طرح ایک صالح اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی جائے تو یہ از خود ہجرت کے پیغام پر یک گونہ عمل ہوگا، عقائد وعبادات، اسلام کے پسندیدہ معاشرہ کی تشکیل، اسلامی معاشرت کا رواج، نکاح وطلاق، تقسیم میراث، آپسی سلوک، نظام تعلیم وتربیت، سچ اور جھوٹ میں تمیز، طیب وخبیث میں تفریق اور ان جیسے اعمال میں اگر اسلام کی اتباع کر لی جائے تو شاید عند اللہ جوابدہی سے کسی حد تک نجات ممکن ہے، یوں تو نجات کا تمام تر مدار محض رب العزت کے فضل وکرم پر ہے، مگر اسی کی تعلیمات میں صراحت ہے کہ نجات کے لیے ایمان وعمل صالح شرط ہے، ہجرت کا یہی پیغام ہے کہ حالات بد سے بدتر ہوں، مسلمان کسی قدر اقلیت میں ہوں، وسائل معدوم ہوں، ہر طرف سے تلواروں کی جھنکار لرزہ طاری کر دے، مگر صاحب ایمان ہے تو تقدیر پر بھروسہ رکھے، ایمان وعقیدے کی حفاظت کرتا رہے، اس کی دعوت میں جی جان سے لگا رہے، احکام خداوندی پر عمل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے، کفر وحرام کے درمیان رہ کر بھی محرمات ومنہیات سے اپنے آپ کو بچالائے، یہی کامیابی کی سبیل ہے، یہی دعوت اسلامی کے ارتقائی سفر کا نقطۂ آغاز ہے، یہیں سے صحابہ کرام کا سفر شروع ہوا تھا، سیرت نبوی کے کامل اسوہ اور جامع پیغام کی ترتیب کو سامنے رکھتے ہوئے عمل کی ابتدا کر دی جائے تو گویا ہجرت کے پیغام کو سمجھ لیا گیا، ایک ہجری سال کے اختتام اور دوسرے کے آغاز پر ہجرت کی یاد اور اس کا ذکر ہمیں انفرادی اور اجتماعی بہر اعتبار محاسبہ کی دعوت دیتا ہے، ہم نے اپنی نجات کے لئے کیا کیا، ملی فلاح وبہبود اور اسلام کی نصرت وحفاظت کے لیے ہم نے کیا قربانیاں دیں، دعوت دین اور خدمت دین کے عنوان سے ہم نے کتنے تقاضے پورے کیے، شریعت پر کس قدر عمل پیرا ہوئے، شریعت کا کتنا حصہ نافذ العمل ہے، کتنا متروک ہے، کتنے حصہ سے غفلت ہے جس پر عمل کے امکانات ومواقع بھی موجود ہیں، اگر اس یادگار تاریخی موقع پر محاسبہ کرتے ہوئے عملی تحریک چھیڑ دی جائے تو مورخ ضرور لکھے گا کہ فلاں ہجری سال کے آغاز پر ہجرت کے انقلابی پیغام کو سمجھ کر عمل درآمد کی ابتدا ہوئی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کام بہت عظیم ہے، اس لئے قربانی بھی بڑی دینی پڑے گی، کامیابی مگر اسی راہ پر چلنے میں ہے، تکلیف ہوگی تو ہوا کرے، پریشانی آئے گی تو آیا کرے، مصائب سے اہل ایمان گھبرایا نہیں کرتے، مصیبتوں سے تھک ہار کر بیٹھ

جانا خدا اور رسول کے سچے متبعین کی سنت نہیں، اگر کسی دل میں یہ وسوسہ بھی آئے تو قرآن کے اس خطاب پر نظر ڈالے اور اپنے دل ودماغ کو نئی قوت بخشے، تحریک عمل کو یہ انداز خطاب کمک فراہم کرتا ہے ولا تهنوا فی ابتغاء القوم ان تكونوا تألمون فانهم يألمون كما تألمون وترجون من الله مالا يرجون وكان الله عليما حكيما (نساء ١٠٤) (ترجمہ: دشمنوں کے تعاقب میں بزدلی اور کمزوری مت دکھانا، اگر تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو دشمنوں کو بھی تمہاری طرح تکلیف ہوتی ہے، لیکن تم اللہ کے جس ثواب کے امیدوار ہو، وہ نہیں ہیں، اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے اور حکمت والا ہے۔)

آج کا منافق میڈیا:

ملک کے حالات خراب تھے، خراب تر ہوتے جارہے ہیں، نت نئے مسائل منہ کھولے کھڑے ہیں، تنازعات اور فرقہ وارانہ منافرت کے واقعات کی تعداد بڑھ رہی ہے، غبن وگھوٹالوں کا تذکرہ ہے، عوام الناس کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام مشکل ہے، وسائل سفر اور اشیاء خوردنی کی قیمتیں آسمان چھو رہی ہیں، لیکن میڈیا مودی جی کی تعریف اور حکومت کی حصولیابیوں میں رطب اللسان ہے۔

کشمیر جہاں گزشتہ دس سالوں سے کسی حد تک حالات پرسکون تھے وہاں گزشتہ دو ماہ میں ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، انسانی حقوق کی دھجیاں بکھیری گئیں، ہزاروں نوجوانوں اور بچوں کو بینائی سے محروم کردیا گیا، وہاں کے سکون کو ایک بار پھر سبوتاژ کر دیا گیا اگرچہ مکمل طور پر حالات کبھی نارمل نہیں ہوئے، مگر گزشتہ دس سالوں میں بہرحال معمول کی زندگی کسی درجہ میں گزر رہی تھی، لیکن اس وقت تو فوج کی بربریت نے کشمیر کی جنت کو جہنم میں تبدیل کردیا ہے، اسے آر ایس ایس کی اس بوکھلاہٹ کا نتیجہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے جس کا مطالبہ وہ عرصہ سے کررہی ہے کہ کشمیر کی ہر خصوصی حیثیت کو ختم کیا جائے جو ہندستان میں انضمام کے وقت دی گئی تھی، الیکشن سے قبل بی جے پی کے انتخابی منشور میں بھی یہ بات شامل تھی، کشمیر میں بری طرح ناکامی پر پوری دنیا میں وطن عزیز کی جگ ہنسائی ہوئی، مگر میڈیا حکومت کو کامیاب دکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا۔

اسی درمیان ''اڑی'' میں دہشت گردانہ حملہ ہوا، وطن عزیز کے ۱۸ فوجی دہشت گردوں کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئے، در اندازی روکنے میں گزشتہ حکومتوں کی طرح یہ ''بڑبولی'' حکومت بھی ناکام رہی، ہمارے ملک کا اتنا بڑا دفاعی بجٹ، اتنی طاقتور فوج، سپر پاور طاقتوں کی صف میں کھڑا ہونے والا ہمارا وطن، لائن آف کنٹرول پر اتنی بھاری نفری اور اس پر دراندازوں کی کامیابی ___ اچانک میڈیا کا رخ پاکستان کی طرف، پھر سرجیکل آپریشن کی خبر، اس پر مستزاد کہ سٹیلائٹ کے اس دور میں اس آپریشن کی کوئی ویڈیو بھی نہیں اور جو ویڈیو وائرل ہوئی بھی اس میں کارروائی دن کی دکھائی جارہی ہے جبکہ خبررات میں آپریشن کی ہے، وزیراعظم کو مبارکباد کا سلسلہ، ساتھ ہی پاکستان کی جوابی کارروائی کا بھی اعتراف، ادھر پاکستان کا دجالی میڈیا ہندوستان کے سرجیکل آپریشن کا

سراپا منکر اور اپنی کارروائی کا بھرپور معترف، نواز-مودی دوستی اچانک خون کی پیاسی دشمنی میں تبدیل ہوتی ہوئی ___ ماضی کے اوراق پلٹیے تو کچھ اور شواہد اس خیال کو تقویت پہنچائیں گے کہ اگر یہ سب کچھ جیسا نظر آرہا ہے ویسا ہی ہے تو کہیں منصوبہ بند طریقہ سے ایک دوسرے کا تعاون تو نہیں جیسا ماضی میں بھی ہوا ہے، حکمرانوں کی تو تاریخ رہی ہے کہ وہ اپنی کرسی کی حفاظت کے لئے عوام اور فوج کو قربان کر دیتے ہیں، خود کشمیر کا مسئلہ آج تک اسی لیے حل نہ ہوسکا کہ پھر سیاست کا مدار اور انتخابات کا موضوع کیا ہوگا ___ آپریشن پر اقوام متحدہ نے بھی کئی سوال کھڑے کر دیے، سرحد پر متعین اس کے نمائندوں کا کہنا ہے کہ ہم نے ایسا کچھ دیکھا ہی نہیں ___ پاکستان کا صاف کہنا ہے کہ گولی باری ہوئی جو آئے دن ہوتی رہتی ہے اس میں دو فوجی انڈین مارے گئے اور دو فوجی پاکستانی ___ گانگریس کی اور پاکستان کی بات میں یک گونہ ہم آہنگی نظر آتی ہے، گانگریس کا کہنا ہے کہ آپریشن تو کئی بار ہوئے ہیں مگر مارکیٹینگ اس بار ہی ہورہی ہے، گویا گانگریس نے بھی میڈیا کے گھناؤنے طرز عمل پر سوال اٹھایا ہے، اڑی فوجی ہیڈ کوارٹر پر حملہ کیوں کر ہوا، کس طرح ہوا، ملک کی خفیہ ایجنسیاں اور سیکورٹی فورسز کس طرح بے خبر رہیں، فوجی ہیڈ کوارٹر تک کسی کی رسائی اتنی آسان بھی نہیں، پرندہ بھی پر مارے تو سنسر بجنے لگتے ہیں، ہیڈ کوارٹر تک پہنچنے کے لئے کئی چیک پوسٹوں پر تفتیشی عمل سے گزرنا پڑتا ہے، بھاری اور چاق وچوبند سیکورٹی ہوتی ہے، پھر وہ مقام تو زیادہ حساس ہے، آخر کیسے چار وحشی صفت گھسنے میں کامیاب ہوئے اور وطن کے جانبازوں کو موت کی نیند سلا دیا، سینکڑوں سوال ہیں، لیکن ان سوالوں سے قطع نظر ہم کہتے ہیں جو کچھ ہوا اور ویسے ہی ہوا جیسے نظر آرہا ہے، جیسے دکھایا جارہا ہے ___ مگر ذرا دیکھیے پاکستان میڈیا سے نواز حکومت کی ناکامیوں پر جو گرما گرم بحث ہورہی تھی وہ یکا یک غائب ہوگئی، اب صرف ہندوستان کے خلاف ہرزہ سرائی ہورہی ہے ___ اور ذرا یہاں کا حال تو دیکھیے جو کچھ کالا دھن لانے کے مطالبات زور پکڑ رہے تھے، وعدے یاد دلانے کا جو دور شروع ہوا تھا، کشمیر میں پیلیٹ گن (Pellet Guns) کے استعمال پر جو بحث چلی تھی اگرچہ اس کا زور میڈیا میں کم تھا لیکن سوشل میڈیا پر بہت تھا، کبھی بابا رام دیو کے کارٹون آرہے تھے کبھی مودی جی کے، کبھی کالے دھن کی واپسی کا مطالبہ تھا کبھی اچھے دن کا طعنہ، کبھی دو کروڑ نوکریوں کا وعدہ یاد دلایا جارہا تھا تو کبھی کچھ اور ___ یکسر میڈیا نے رخ بدل دیا، لوگ آپس میں ہی لڑنے لگے، کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی اور پیلیٹ گن کے استعمال سے عالمی قانون کی مخالفت پر گھری حکومت یکسر اپنی ناکامی سے نکل کر عوام کی حمایت حاصل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوگئی، اب لوگ صرف اور صرف حکومت کو سہارا دینے لگے، دیش بھکتی کی باتیں کرنے لگے، فوج کی بہادری کے تذکرے ہونے لگے، اسی موضوع پر مباحثے ہونے لگے، اس بار پاکستان رہے گا یا تہس نہس ہوگا ہر چینل اس کا جواب دینے میں دوسرے سے آگے نکل جانے کے لیے کوشاں نظر آنے لگا۔

اس پورے قضیہ میں دو باتیں بہت خطرناک نظر آئیں لیکن میڈیا کے مبصرین نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی، چہار جانب سے آر ایس ایس کو ایک دہشت گرد تنظیم کہا جاتا ہے اور اس پر انصاف پسند غیر مسلم بھی آئے دن پابندی کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں

لیکن میڈیا میں اس وقت بھی کوئی ابال نہیں آیا جب ہمارے وزیر دفاع نے یہ کہہ کر اس قضیہ کو ایک الگ ہی رخ دے دیا کہ آپریشن آر ایس ایس کی ٹریننگ کا نتیجہ ہے، اس پر میڈیا کو تو آسمان سر پر اٹھا لینا چاہتے تھا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا، سوچیے ذرا وہ ذہنیت کتنی خطرناک ہے جو حکومت اور میڈیا کی مشنری کے پیچھے کارفرما ہے، اس پر مستزاد دوسرا خطرناک پہلو وزیر اعظم کے بیان سے سامنے آیا، انہوں نے کہا کہ فوج کی یہ کارروائی اسرائیلی فوج کی کارروائی کے مشابہ ہے، ہم کئی مرتبہ برسر اقتدار لوگوں کی یہود دوستی پر اظہار کر چکے ہیں اس سے غفلت بڑی تباہی کا باعث کا بن سکتی ہے، قرآن مجید نے یہود و مشرکین کی اسلام دشمنی میں شدت و یکسانیت کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے لتجدن اشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين اشركوا.....الخ (ترجمہ: آپ ایمان والوں کے سب سے کٹر اور سخت دشمن یہودیوں کو پائیں گے اور مشرکوں کو۔)

یو، پی الیکشن سے بھی لوگوں کی توجہ یکا یک ہٹ گئی، بلکہ بی جے پی کو اس آپریشن کا نفع ملنے کی امید ہوگئی ــــــ یو پی الیکشن کا ذکر آ گیا تو سن لیجئے، ہم زمینی حقائق سے واقف ہیں، مگر آر ایس ایس کے ترجمان پرنٹ میڈیا پر مستقل ہماری نظر ہے کہ وہ کس طرح ایک ایسی پارٹی کے بے نام اتحاد کو پروجیکٹ کر رہا ہے، جو آزمودہ بھی ہے اور بے نام بھی، ظاہر ہے کہ اس کے لیے دونوں کو بڑا معاوضہ دیا گیا ہوگا، مگر اف رے میڈیا کی جعلسازی اور منافقت!! میڈیا کے نفاق کا یہ تجربہ بار بار ہوا ہے، عالمی پیمانے پر بھی اور ہندوستان کے پس منظر میں بھی، اس دجالی میڈیا نے فلسطینوں کے حقوق کی پامالی پر ہمیشہ آنکھیں بند رکھی، ان کی مزاحمتی تحریک کو بھی دہشت گرد لکھا، عراق کو جھوٹ بول بول کر تباہ کرانے کی فضا ہموار کی، افغانستان کے لیے کھنڈر تیار کیا، ظلم کی راہ ہموار کرتا ہے، بارہا دیکھا اور سنا کہ جب عدالت کسی کو دس- پندرہ سال بعد باعزت بری کری دیتی ہے تب بھی یہ میڈیا اسے ملزم، مبینہ ملزم اور دہشت گرد کے القاب سے یاد کرتا ہے، جس وقت کسی پر الزام عائد ہوتا ہے تو مشرق و مغرب کے قلابے ملا دیتا ہے، پولیس اور عدالت سے پہلے ہی یہ کسی بھی واقعہ کے رونما ہوتے ہی اسے اسلام سے جوڑ دیتا ہے اور ملزمین کو مسلم دہشت گرد ثابت کر دیتا ہے، اس کا کام تھا صحیح خبریں لوگوں تک پہنچانا، اہل اقتدار کی گرفت کرنا، سچ کے لیے رائے عامہ ہموار کرنا، لیکن اب قدریں بدل گئیں، قلم بکتے ہیں، ضمیروں کا سودا ہوتا ہے، جھوٹ کی رٹ لگا کر اسے سچ ثابت کیا جاتا ہے، یہی اس موقع پر ہو رہا ہے تو کچھ نیا نہیں ہو رہا ہے، ہاں مگر نئی یہ بات ہے کہ اس میڈیا کو منافق کہنے کا جواز راقم کو قرآن مجید سے ملا، قرآن مجید نے منافقین کے کردار کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا ہے: وإذا جاء هم امر من الأمن أو الخوف اذا عوا به (نساء ۸۳) کہ یہ منافق امن وسلامتی یا خوف و دہشت کی کوئی خبر بھی پاتے ہیں تو بس اس کو عام کر دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، افواہوں کا بازار گرم کر دیتے ہیں، حالانکہ حکم خداوندی یہ ہے کہ کوئی خبر ملے تو اسے رسول اور اب ماہرین شریعت اور دیگر ذمہ داروں تک پہنچائیں اور وہ اس کے مصدر و مرجع کی بابت تحقیق کریں، آیت کا یہ ٹکڑا بالخصوص ہدایت ہے ان لوگوں کے لیے جو سوشل میڈیا کا خوب استعمال کرتے بلکہ اسی پر تکیہ کر بیٹھے ہیں ولو ردوه إلى الرسول والى أولي الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم، آیت کے پہلے

حصہ اور اس کے پس منظر پر غور کیجئے، شکلیں بدل گئیں، وسائل بدل گئے اور یہ ہر زمانہ میں بدلا کرتے ہیں، مگر آج بھی میڈیا کا یہی منافقانہ کردار ہے، اذا عوا به پر غور کیجئے اور محطات الاذاعات کی تصویر دیکھیے اور قرآن کریم کی حقانیت پر اپنا ایمان تازہ کیجئے، کیسا بھرپور تبصرہ ہے اور کیسی گہری تعبیر ہے۔

میڈیا کے اس کردار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ یا ایها الذین آمنوا إن جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا أن تصیبوا قوما بجهالة فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین۔

تحلیل و تجزیہ کرنے والوں کی کل بھی ضرورت تھی اور آج بھی ہے، میڈیا اور مسلمان میڈیا کی جتنی کل ضرورت تھی ہر آئندہ دن اس کی ضرورت دوچند ہوتی جاتی ہے، جس کا مقصد وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان، جس کا مطمح نظر لتخرج الناس من الظلمات الی النور پر مبنی ہو، جس میں قولوا قولا سدیدا کی صفت ہو، جو انسانیت کی بھلائی، فلاح و بہبود اور نیکیوں کو رواج دینے اور فحاشی و معصیات کے فروغ کو روکنے کا کام کر سکے، میڈیا اس دور کا مہلک ترین ہتھیار ہے اور کامیاب ترین وسیلہ بھی، رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، بالخصوص ان لوگوں کو جنہیں برپا ہی کیا گیا ہے ''لوگوں'' کی نفع رسانی کے لیے اور جن کا فرض منصبی ہی یہ قرار پایا ہے کہ وہ ہر معروف کو عام کریں اور ہر برائی کا سدباب کریں، اگر اس سے اسلام کو قوت و شوکت ملتی ہے تو اس کی تیاری اور اس کا استعمال ما استطعتم کی تفسیر ہے، واعدوا لهم ما استطعتم من قوة۔

لوگ حلب کو بھول گئے مگر اردوغان نے یاد رکھا

2011 سے شام میں طاغوتی اور ظالمانہ نظام کے خلاف انقلابی تحریک شروع ہوئی، ۶ سال کا طویل عرصہ گزر گیا، مزاحمت کاران شام پوری امت کی طرف سے روزانہ اپنے خون کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں محتاط انداز نے کے مطابق اب تک چار لاکھ سنی مسلمان شہید ہو چکے ہیں، بے شمار زندہ انسان مفلوج و بے کار ہو چکے ہیں، لاتعداد خواتین کی عصمت پامال ہو چکی ہے، لاکھوں تعداد یوروپی ممالک کی طرف ہجرت کر گئی ہے، وہاں پناہ گزینی کی قیمت اسے اپنے ایمان سے چکانی پڑی ہے، بے شمار بچے روزانہ سسک سسک کر دم توڑ رہے ہیں، شام کے سب سے مقدس شہر اور اہل سنت کے سب سے پر جوش و باحمیت مرکز حلب کو تباہ و برباد کر کے کھنڈر میں تبدیل کر دیا گیا ہے، عالم اسلام کی مجرمانہ خاموشی حسب دستور قائم ہے، سپر پاور اپنی منافقت کے سبب مجبور ہے، بشار کے قصابی نظام کی بقاء میں اسرائیل کی ضمانت ہے اور اسرائیل کی بقاء کا امریکہ محافظ ہے، یزید کے ظلم پر محرم میں ماتم کرنے والے خود اس وقت عالم اسلام کے مختلف خطوں بالخصوص شام اور حلب میں یزیدی کردار ادا کر رہے ہیں، حلب کی تباہی و بربادی اور باغیرت و پر جوش اہلسنت کے مظلوم بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور سرمایہ ملت کے نگہبان نوجوانوں کے بہیمانہ قتل عام پر

بس یہ اشعار دوہرانے کا دل کرتا ہے جو حضرت زین العابدینؒ کی روایت کے مطابق حضرت حسینؓ نے اپنی شہادت سے قبل یعنی دس محرم کی رات میں کئی بار دوہرائے تھے۔

يا دهر أف لك من خليـل	كم لك بالاشراق والاضيل
من صاحب أو طالب قتيل	والدهر لا يقنع بالبديـل
وإنما الأمر إلى الجليـل	وكل حى سالك السبيـل

(اے زمانے تیرا برا ہو! تو کیسا بے وفا دوست ہے کہ ہر صبح وشام تیرے ہاتھوں کتنے انسان مارے جاتے ہیں اور تو کسی کی رعایت نہیں کرتا، کسی سے عوض بھی قبول نہیں کرتا اور سارا معاملہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، ہر زندہ شخص موت کی راہ پر چلا جا رہا ہے)۔

عالم اسلام سے اس وقت کسی طرح کی امید بھی باقی نہ رہی، وہ چاہتے ہوئے بھی کیا کر سکتے ہیں۔ قرآن کی مخالفت کی قیمت تو دیر سویر دینی پڑتی ہے، ان لوگوں سے دوستیاں رچائی گئیں جو خواہشات کے بندے اور نفس پرست ہیں، نفسانی خواہشات کی اتباع کبھی دین وایمان کا سودا کرا ہی دیتی ہے، ان لوگوں پر تکیہ کیا گیا جن پر قرآن نے لعنت بھیجی اور جو دین اسلام کے کھلے دشمن ہیں فرمایا گیا اولـئك الذين لعنهم الله ومن يلعن الله فلن تجد له نصيرا، یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت بھیجے اس کے لیے تم کوئی مددگار نہیں پاؤ گے، باوجود قرآن کی تنبیہ کے اور صراحت سے منع کرنے کے اپنی قسمت تحفظ کے نام پر امریکہ کے حوالے کر دی گئی چہ جائیکہ کفار سے طلب معاونت کو بھی قرآن پاک نے حرام قرار دیا ہے ولا تتـخـذوا منهم وليا ولا نصيرا، کہا گیا ہے کہ تم ان میں سے کسی کو نہ کارساز بناؤ نہ مددگار، ایک روایت میں آتا ہے کہ کفار کے خلاف انصار نے جب یہود سے مدد طلب کرنے کی اجازت آپؐ سے چاہی تو حضورؐ نے واضح الفاظ میں تنبیہ فرمائی الـخبيـث لا حـاجة لـنـا بهم یہ خبیث قوم ہے اس کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ کفار ومشرکین سے دوستی اس لئے رچائی گئی، امریکہ کو محافظ اس لیے تصور کیا گیا کہ عزت وقوت حاصل ہو جائے گی، عزت کا مطلب ہی قوت وغلبہ ہے، اور یہ عزت وقوت اور غلبہ تو خاص ہے اللہ کے لیے ايبتـغـون عـنـدهـم العزة فان العزة لله جميعا، کیا یہ لوگ ان کے پاس عزت طلب کرتے ہیں بے شک عزت تو تمام تر اللہ کے لیے ہے، جن کے نصیب میں خود عزت نہیں ان سے عزت وقوت کی امید کرنا نادانی ہے، جو مغضوب وضالین ہیں، جن کی کھلی عداوت کی نشاندہی قرآن مجید نے کی ہے ان سے دوستی کرنا اور اچھی امید کرنا ہی فضول ہے، قوت وغلبہ کی خواہش پوری کرنے کے لئے عزت وشوکت کے اصل مالک کو ناراض کرنا کم عقلی ہے، اسی کو اور واضح کرتے ہوئے قرآن نے کہا ولـلـه الـعـزة ولرسوله وللمومنين ولكن المنٰفقين لا يفقهون، عزت تو اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے ہے لیکن یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں۔

لیکن صورت حال کچھ ایسی ہوئی کہ ہمارے ممالک کی قسمت کے محافظ یہود ونصاریٰ قرار پائے، جزیرۃ العرب میں

مشرکانہ عبادتوں کے معبد تعمیر ہونے لگے، رؤسائے مشکرین کو بڑے بڑے انعامات سے نوازا جانے لگا، حضرت عمرؓ کے زمانے میں قبیلہ ثقیف کے ایک شخص کی دکان صرف اس لئے جلوادی گئی کہ وہ چوری چھپے شراب فروخت کرتا تھا، اب اسی پاک خطہ میں نائٹ کلب اور شراب کے اڈوں کی باڑھ آ گئی ___ دشمنان اسلام نے صلاح الدین ایوبی سے شکست کے بعد ہی یہ عزم کرلیا تھا کہ اب مسلمانوں کو میدان میں نہیں بلکہ علمی، تہذیبی اور فکری لحاظ سے شکار کرنا ہے، وہ اس میں کامیاب ہوگئے، طرفہ یہ کہ مسلمانوں نے اپنے وسائل کا مالک بھی ان ہی کو بنادیا، خذوا حذرکم اورواعدوا لھم مااستطتم سے غافل ہوگئے، سائنس وٹکنالوجی کے فروغ کی جگہ عیش پرستی نے پائی، صنعتوں کے قیام کی جگہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ملی، مصنوعات میں ترقی کی جگہ درآمدات نے لی، طاغوتی نظام وتہذیب کی بالادستی تو قائم ہو ہی رہی تھی، اسباب ووسائل کے اختیار سے غفلت نے اندر سے مزید کھوکھلا کردیا، اس وقت خلیج اور بالخصوص سعودیہ کو جو مسائل درپیش ہیں وہ ان ہی غلطیوں کا خمیازہ ہیں، جو ماضی میں ہوئی ہیں، جن پر سید قطبؒ نے متنبہ کیا، مولانا علی میاںؒ نے بار بار یاددہانی کرائی، ماذا خسر العالم کا آخری باب اسی موضوع پر ہے، اس کو مختصر کرکے رسالہ کی شکل میں شائع کرکے اس جانب متوجہ کرنے کی غرض سے عام کیا۔ مگر افسوس ہوش کے ناخن نہ لیے گئے! حل اب بھی صرف ایک ہے الی الاسلام من جدید، صرف اور صرف اسلام کی طرف رجوع، اگر إن کنتم مومنین کی شرط پوری کردی جائے تو یقیناً غلبہ دین کے ساتھ نعمتِ دنیا کی فراوانی کا وعدہ الٰہی بھی پورا ہوگا، دنیا کی لذتیں صراط مستقیم پر گامزن ہوکر بھی حاصل کی جاسکتی ہیں، صحابہ کرام کو بھی دنیا کی کشائش سے ہمکنار کیا گیا، ایمان وعمل صالح پر اخروی جزاء کے ساتھ ساتھ دنیاوی وسعت وکشائش کا الٰہی وعدہ اور قرآنی بشارت موجود وبرحق ہے، اس وقت امریکہ وروس اور ایران سب نے مل کر عرب ممالک بالخصوص سعودیہ کے خلاف جو ڈرامہ تیار کیا ہے وہ انتہائی خطرناک ہے، اس کے تصور سے بھی لرزہ طاری ہوتا ہے، حلب میں روس کی ظالمانہ اور جارحانہ بمباری اور اس پر امریکہ کی خاموشی کے ساتھ سعودیہ کی تیزی سے گرتی ہوئی معیشت اور ایران کے بڑھتے ہوئے اثرات سینکڑوں مہیب سوال کھڑے کرتے ہیں۔

بہرحال عالم اسلام کی اس کسمپرسی کی حالت میں ہم صرف خداوند قدوس سے دعا ہی کرسکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں میں بیداری پیدا کرسکتے ہیں، علماء کرام کو چاہیے کہ وہ اس وقت صحیح موقف اختیار کریں، اپنے منصب کی رعایت کریں اور نصح وخیرخواہی کا بنیادی وشرعی اور اپنا منصبی فریضہ انجام دیں، عالم اسلام کے حکمرانوں اور اصحاب دانش کو پوری قوت کے ساتھ اصل مسائل کی طرف متوجہ کریں اور شام کے مسئلہ پر گفت شنید جاری رکھیں تاکہ شام کا مسئلہ دبنے نہ پائے، عالمی ظالموں کو یہ نہ محسوس ہو کہ لوگ شام کو بھول گئے۔

عالم اسلام اس وقت بڑے نازک اور مایوس کن دور سے گزر رہا ہے مگر اس دور میں بھی ایک امید کی کرن روشن ہے، اس قندیل شب آخر کو رجب طیب اردوغان کہتے ہیں، عیسائی ویہودی دنیا اب جس کے درپۂ آزار ہے، خدا نے اس مرد آہن کو حکمت

ودانش کے ساتھ بلا کی جرأت ایمانی اور جذبۂ اخوت سے نوازا ہے، ایسے وقت میں جب سب نفسی نفسی کی کیفیت میں ہیں اس مرد خدا کے زیر نگیں مملکت تقریباً ۳۰ لاکھ شامی بھائیوں کی میزبان ہے، کاش عرب کے صحراؤں میں پلاسٹک کے خیمے، پینے کا پانی اور کھجور کی غذا کے سہارے یورپ جا کر دین سے دستبردار ہونے والوں کو پناہ دی گئی ہوتی، اردوغان نے تو خدا تعالیٰ کی توفیق سے ان شامی "مستضعفین فی الارض" کی خاطر تمام تر بنیادی اور بہتر سہولیات بھی سرکاری طور پر فراہم کی ہیں، جبکہ غیر سرکاری طور پر دسیوں لاکھ پناہ گزیں مزید تر کی میں اپنے طور پر زندگی کاٹ رہے ہیں، ابھی کل کی بات ہے اردوغان نے بڑی صراحت کے ساتھ انقرہ میں یہ بیان دیا کہ ہم شامی قوم کے ساتھ کھڑے ہیں، تاریخ عنقریب ان ممالک سے حساب لے گی جو حلب میں ڈھائے جارہے مظالم پر خاموش ہیں، انہوں نے کہا کہ عالمی برادری شام کے قضیہ کو سنجیدگی سے حل کرنا ہی نہیں چاہتی جبکہ ہم شامی قوم کے تئیں اپنے انسانی فرائض ادا کر رہے ہیں، ان کو اس کا بھی اندازہ ہے اور انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا کہ اگر ہم اپنے ملک میں سکون وامن کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ عراق وشام میں امن وسلامتی کی فضا قائم ہو، اس سے قبل اردوغان نے شمعون پیریز کے انتقال پر بھی اپنے جرأتمندانہ موقف کا اظہار کچھ یوں کیا تھا کہ یہ لوگ بچوں اور انسانوں کے قاتل ہیں، اردوغان کے یہ بیانات ایسے وقت میں آئے ہیں جبکہ ان کو داخلی چیلنجز کا سامنا ہے، مختلف اسباب وعناصر کے سبب وہاں ناکام فوجی بغاوت وجود میں آچکی ہے، تطہیر کا عمل جاری ہے، ایمرجنسی نافذ ہے، عمل تطہیر خود انتہائی خطرناک عمل ہے، یہ الگ بات کہ اب تک اردوغان کی طرف سے زیادتی کی رپورٹنگ نہیں ہوئی، بڑی حد تک مغرب کٹہرے میں پہنچ جانے کے سبب خاموش تماشائی یا کسی نئے ڈرامہ کو اسٹیج کرنے کی تیاری میں مصروف ہے۔

اردوغان نے شام وترکی کے مسائل سے دلبرداشتہ ہوکر حقیقت بیانی کا حق ادا کرتے ہوئے اس مرتبہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اپنے خطاب میں کہا کہ اقوام متحدہ کے مختلف اداروں بشمول سلامتی کونسل میں اصلاحات کی سخت ضرورت ہے، انہوں نے سلامتی کونسل کے مستقل رکن ان پانچ ممالک پر اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا جن کو ویٹو پاور کے استعمال کا حق ہے، انہوں نے کہا کہ یہ طریقۂ کار مہذب دنیا کے لئے کلنک ہے، انہوں نے (Big Five) پانچ عالمی طاقتوں امریکہ، فرانس، چین، برطانیہ، روس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ پوری دنیا کو ان پانچ طاقتوں کے ہاتھ میں یرغمال بنا دیا گیا ہے، تمام ممالک اگر کسی بات پر متفق ہوجائیں یا کسی چیز کی مخالفت کریں تو کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ سب کی قسمت کی مالک یہ پانچ طاقتیں ہیں جو موقع بہ موقع ویٹو پاور کا استعمال کرتی رہتی ہیں، انہوں نے اس عمل کو غیر اخلاقی اور غیر جمہوری قرار دیا، انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ ان پانچ قوتوں میں ایک بھی اسلامی ملک شامل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک اقوام متحدہ مسلم ممالک کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہی ہے اور اس نے اب تک صرف عیسائی دنیا کے مسائل کو حل کیا ہے، یہ گویا آخری درجہ کی بات ہے جو اردوغان نے عیسائی دنیا کے گوش گزار کردی ہے۔

یہ بات انہوں نے ایسے موقع پر کہی جب کہ حلب جل رہا ہے بلکہ جل کر تباہ ہو چکا ہے، اب وہاں ضروری دواؤں کا فقدان ہے، لوگوں کے پاس کھانے کو پتے اور پینے کو گندا پانی بھی نہیں بچا ہے، بعض افسوسناک رپورٹوں کے مطابق لوگ پیشاب پینے پر مجبور ہیں، اقوام متحدہ شام کا قضیہ حل کرنے میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے، بلکہ وہ روس وامریکہ کے مظالم کا ایک تماشائی کی طرح میدان میں کھڑی ہو کر تماشا دیکھ رہی ہے۔

اردوغان کا یہ بیان مبنی بر حقیقت ہے، اقوام متحدہ کی کارکردگی کی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ اس نے ہمیشہ چند ممالک ـــــ جو ویٹو کے کھلاڑی یا ان کے حمایت یافتہ ہوں ـــــ کے مفادات کے تحفظ کے سوا کچھ نہیں کیا ہے، گویا بالفاظ دیگر اسلام دشمنی میں وہ بھی برابر کی شریک رہی ہے، شام وعراق اور افغانستان کے مسئلہ میں اس کی مجرمانہ خاموشی یا صرف بیان بازی اس کی واضح دلیل ہے، اردوغان کی اس صاف گوئی اور حق بیانی پر ہم نہ صرف ان کے شکر گزار ہیں بلکہ دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی ہر شر اور فریبیوں کے ہر مکر سے حفاظت فرمائے، جس طرح انہوں نے قضیہ شام وفلسطین پر ایمانی موقف اختیار کر رکھا ہے اور جس طرح انہوں نے مصر سے تعلقات منقطع کر رکھا ہے اور تعلقات کی بحالی کی یہ شرط رکھی ہے کہ محمد مرسی اور ان کے ساتھیوں کو رہا کیا جائے، کیوں کہ وہ ۵۲ فیصد سے زائد ووٹوں سے منتخب ہو کر صدر بنے تھے جب کہ موجودہ صدر غاصب ہے، اور جس طرح انہوں نے اقوام متحدہ میں اس کا اظہار کیا ہے کہ مسلم ممالک کے مسائل حل کرنے کے لئے سلامتی کونسل کے پانچ سپر ارکان میں کسی مسلم ملک کا ہونا ضروری ہے، یہ جہاں ان کی شفاف اسلامی ذہنیت کا غماز ہے وہیں ان کے لیے خطرات کا پیش خیمہ بھی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردوغان پر یہ بات خوب واضح ہے کہ مسلم ممالک کے مسائل کا حل اور مسلمانوں کی عزت وشوکت خود مسلمانوں ہی کے ذریعہ ممکن ہے یہود ونصاریٰ سے اس کی امید فضول ہے۔

ہندوستان کے عوام کو چاہیے کہ وہ اہل شام اور عالم اسلام کے اس مرد مجاہد کے لئے دعائیں کرتے رہیں، شام کے مسئلہ پر لکھیں اور بولیں، ائمہ اور خطباء حلب کے مظلوموں اور کمزوروں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں بلکہ ان کے لیے خصوصی دعاؤں کا اہتمام کریں، ملی تنظیموں کو اس مسئلہ کو شدت کے ساتھ اٹھانے، احتجاج کرنے اور عرب ملکوں کے سفراء سے بات کرنے پر آمادہ کریں، ہر فرد مسلم ملت کا حصہ ہے، اور ملی مسائل سے یکسر غفلت جرم ہے، بقدر استطاعت ملت کے لئے عمل کرنا ایمانی اور ملی تقاضہ ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

خاص تحریر

گاہ گدڑی میں لعل ہوتے ہیں

(مفتی محمد ظہور ندوی)

(۱۹۲۷ء-۲۰۱۶ء)

محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی

۲۰۰۲ء کا ذکر ہے جب یہ حقیر عالم اسلام کی عظیم اور شہرۂ آفاق علمی دانش گاہ ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' (لکھنؤ، یوپی، انڈیا) میں اعلیٰ تعلیم کے لئے حاضر ہوا تھا، ندوۃ العلماء کا نام میرے کانوں کے لیے نامانوس نہ تھا، اپنے برادر اکبر اور مخدوم ومربی مولانا احمد ضیاء ندوی کی زبانی بارہا اس عظیم دانشگاہ کی علمی وادبی فضا اور یہاں کی محترم ونامور شخصیات کا تذکرہ سنا کرتا تھا، اس طرح اس کی زیارت سے پہلے ہی اس کی محبت وعقیدت دل میں گویا جگہ پا چکی تھی:

أتانی هواها قبل أن أعرف الهویٰ

فصادف قلبًا خالیا فتمکنـــــا

(اس کی محبت اس وقت آئی جب محبت سے میری راہ ورسم بھی نہ تھی، پھر کیا تھا، محبت نے قلب کو خالی پایا اور اس میں جاگزیں ہوگئی)

جب مجھے مادر علمی میں کم وبیش ۵ سال کا تب تقدیر کے فیصلے کے مطابق گزارنے کی سعادت میسر ہوئی تو یہاں کی علمی وادبی، فکری ودعوتی اور تعلیمی وتربیتی فضا کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملا ..... یہاں کے اساتذہ کے علم وفضل، خلوص وللّٰہیت، مہر ومحبت، لطف وکرم، لینت ومروت، سادگی وبے تکلفی، ورع وتقوی اور زہد واستغنا جیسے اوصاف وکمالات کی تہیں مجھ پر کھلتی گئیں، اور مجھے یقین ہوتا گیا کہ " علمی قوت حیدری کا بھی مدار نانِ شعیر ہی پر ہے"

جنھیں سحر نگل گئی .....

مجھے حضرت الاستاذ مفتی محمد ظہور ندوی (جنہیں رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہوئے آج جگر شق ہو رہا ہے) سے ضابطے کی شاگردی کا شرف کبھی حاصل نہ ہوسکا، البتہ وہ میرے رابطے کے استاذ ضرور رہے، اور گاہے بگاہے آپ کی علم آموز صحبت سے استفادے کی توفیق بھی ملتی رہی، آپ کی علمی صحبت میں بیٹھ کر اندازہ ہوتا کہ آپ کی شخصیت ایک " عطر مجموعہ " سے کم نہیں، مفتی صاحب علیہ الرحمہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے الفاظ میں (جو انہوں نے مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کی وفات کے موقع پر کہے تھے):"...ایک بہت اچھے انسان، بہت اچھے دوست، بہت اچھے شاگرد، بہت اچھے استاد، بہت اچھے شوہر، بہت اچھے باپ اور بہت اچھے عالم تھے، ان کا دل چیر کر دیکھا جاتا تو ان کے سویدائے دل کے اندر

حسین اور شامّہ نواز گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دیتی، وہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ مصری کی ڈلی چبا رہے ہیں، اور اپنے مخاطب کا من موہ رہے ہیں، جس کے ساتھ رہے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ وہ حبیب ہیں کہ محبوب"

آج جب اپنے اس محبوب اور گوشہ نشیں مجمع کمال استاذ کی رحلت کی خبر وحشت اثر ملی تو یقین جانیے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا، ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور آنکھوں کے رستے جذبات کا سیل رواں بہہ نکلا، اپنی دوری اور فراق ومجبوری پر دل مسوس کر رہ گیا مجھے ابھی ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میری حسین ورنگین دنیا میری نظر میں نہایت غمگین اور اندوہ گین ہوگئی ہے، حضرت مفتی صاحب اگر چہ "چراغ سحر" تھے، لیکن "امید کی کرن" بہر حال باقی تھی، افسوس کہ "امید کی کرن" بھی جاتی رہی، "سحر کا چراغ" بھی گل ہوگیا اور اس طرح منوں من مٹی کے نیچے لاکھوں من وزنی علم وفضل کو لے کر ہمیشہ کے لیے حضرت مفتی صاحب تہہ خاک ہوگیے، انا للہ وانا الیہ راجعون

سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم لکھتے ہیں: "اقبال کا خیال تھا کہ سوگواری کی ظلمات میں مرنے والوں کی یادوں کی جبیں اسی طرح چمکتی رہتی ہے جس طرح اندھیری رات میں تارے چمکتے رہتے ہیں، معلوم نہیں کب تک میری آنکھیں دیکھتی رہیں گی کہ وہ آرہے ہیں، جا رہے ہیں"............

" حالی نے اپنے استاذ "غالب" کی وفات کے بعد بزم سلطانی، تخت خاقانی، راح ریحانی، عقل رمانی اور حسن کنعانی کو فانی پاکر بحر ہستی کو محض سراب اور طلسم خیال پایا تھا، اب سے پہلے حالی کے ان جذبات کو محض شاعرانہ تخیل سمجھتا تھا، مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ کیفیات حقیقت بھی بن جاتی ہیں"......

(بزم رفتگاں:/۲۰۲)۔

حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی ہشت پہل شخصیت میں قسام ازل نے گوناں گوں خوبیاں ودیعت کر رکھی تھیں، آپ کا ہر وصف انوکھا، ہر خوبی نرالی اور ہر صفت بے نظیر تھی۔

آپ کی فطرت میں طباعی، دقیقہ رسی، ذہانت وذکاوت اور ظرافت وبذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، قدرت کی طرف سے دماغ بھی انتہائی سلجھا اور صاف لے کر آئے تھے، پیچیدہ مسائل اور مشکل گتھیوں کے حل میں آپ کا تیر نظر کبھی خطا نہ کرتا تھا، استاذ محترم مولانا منور سلطان ندوی صاحب آپ کے استحضار علمی کے بارے میں ارقام فرماتے ہیں:

" آپ کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ ہدایہ کی جلدیں گویا آپ کو حفظ ہیں .... ایک بڑی خلقت آپ سے استفادے کے لیے ہروقت منتظر رہتی ہے، دار العلوم کے اساتذہ بھی مشکل اور پیچیدہ مسائل میں آپ سے رجوع کرتے ہیں" (ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابنائے ندوہ کی فقہی خدمات:)

چند اوصاف وکمالات:

" سادہ مزاج وسادگی پسند، مرنجان مرنج طبیعت کے مالک، ظاہری شان وشوکت اور تکلفات سے بے نیاز، انتہائی خلیق وخاکسار، ہر شخص سے کھل کر ملنے والے، ظرافت پسند، فقہی جزئیات کے حافظ اور بحر فقہ کے شناور، ہر جگہ مسئلہ بتانے والے اور ہر کس وناکس کو جواب دینے والے مفتی، اعلی درجے کے ذہین ونکتہ رس، حاضر جوابی کی دولت سے سرشار، علماء وعوام دونوں طبقوں میں یکساں مقبول ومحترم، قانونی موشگافیوں سے واقف، انتظامی امور کے کوچے سے آشنا اور بہترین مدبر ومنتظم (حوالہ سابق)۔

ان اوصاف وکمالات کو آپ ترتیب دیں، پھر ذہن کے پردۂ سیمیں پر شخصیت کی جو تصویر ابھرے، اس پر لکھدیں "مفتی محمد ظہور ندوی"۔

علم فقہ سے تعلق ودلچسپی اور اس میں درک وبصیرت :

یوں تو حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ نے علم کی ہر شاخ سے پھول توڑے تھے اور ان سے اپنے گلشن علمی کو سجایا اور سنوارا تھا، لیکن آپ کا اصل میدان جہاں آپ کا جوہر خوب خوب چمکا وہ "فقہ کا میدان" تھا، اس علم سے خصوصی مناسبت آپ کو شروع سے ہی رہی، استاذ محترم مولانا منور سلطان صاحب ندوی مدظلہ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:"مفتی صاحب کو "علم فقہ" سے خصوصی اور گہرا تعلق زمانہ طالب علمی سے ہی رہا ہے، اور اس میں بڑا دخل آپ کے مربی خاص مولانا سعید صاحب ندوی کا ہے، جو اُن دنوں ندوہ العلماء کے مفتی تھے، ان کی نگرانی وسرپرستی میں آپ نے دارالعلوم کا علمی سفر مکمل کیا، مفتی سعید ندوی صاحب کی توجہات کی وجہ سے فقہ کے قدیم وجدید مآخذ ومصادر سے استفادہ کا موقع ملا، اور فکر ونظر میں وسعت اور مزاج میں تفقہ پیدا ہوا، دارالافتاء کی ذمہ داری اور طویل عرصے تک فقہی کتابوں کی مناسبت کی وجہ سے آپ کو اس فن پر پورا عبور سا حاصل ہوگیا ہے"(ایضا:۵۳۳)۔

مفتی صاحب کی ظرافت کے چند مشاہداتی نمونے :

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیمی سال کے آغاز میں دارالعلوم کی وسیع وعریض اور پرشکوہ مسجد میں طلباء عزیز کے لئے "تربیتی پروگرام" کی ایک روایت مدتوں سے چلی آرہی ہے، مختلف بڑے اساتذہ کے خطابات ہوتے ہیں جو اپنے تجربات کی روشنی میں علمی، تربیتی اور فکری باتیں پیش کرتے ہیں؛ تاکہ طلبا یہاں کے علمی ماحول اور تعلیمی فضا سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاسکیں۔

تربیتی پروگرام کے دنوں میں اچانک ایک دن ندوۃ العلماء کے نامور اور لائق استاد (غالبًا) مولانا عارف صاحب سنبھلی علیہ الرحمہ نے یہ اعلان کرکے سبھوں کو چونکادیا کہ آج مفتی صاحب کا خطاب ہوگا، اعلان سنتے ہی اساتذہ اور طلبہ بصد شوق بیٹھ گئے، مفتی صاحب نے کرسی پر تشریف لاتے ہی فرمایا "آج میری تقریر کا عنوان ہے بلاعنوان" مسجد کی پوری مجلس باغ وبہار میں تبدیل ہوگئی، مجھے یاد پڑتا ہے کہ پھر سورۃ الحجرات کی روشنی میں نہایت ہی مختصر اور پرمغز خطاب فرمایا۔

بہار سے میرے ایک استاذ ندوے تشریف لائے، مفتی صاحب سے ان کے دیرینہ مراسم تھے، مجھے لے کر مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، مجھ سے پوچھا: کہاں کے ہو؟ میں نے کہا: مظفر پور، فرمانے لگے: مظفر پور کی لیچی بڑی لذیذ ہوتی ہے، میں نے کہا: انشاء اللہ آئندہ موسم رہا تو لیتے آؤنگا، انہوں نے میرے جذبات کی قدر کرتے ہوئے ڈھیر ساری دعائیں دیں، گفتگو کے دوران اچانک ذکر چل پڑا ندوۃ العلماء کے موجودہ باوقار مہتمم مخدومی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم کا، موقع کی مناسبت سے میرے استاد محترم نے مفتی صاحب سے پوچھا: "سنا ہے مہتمم صاحب آپ کے شاگرد ہیں؟" مفتی صاحب نے فرمایا: بنتے بنتے بچ گیے"، مجھے اس ظریفانہ جملے پر بے ساختہ ہنسی آگئی، پھر مسکراتے ہوئے فرمایا: " بات اصل یہ ہے کہ جس سال

میرا یہاں تقرر ہوا تھا اسی سال مہتمم صاحب پڑھنے کے لیے آئے تھے، لیکن چونکہ وہ ادب کے لیے آئے تھے اور میں شریعہ کا استاذ تھا، اس لیے وہ بچ گیے، البتہ استاذ تو بہر حال ہوں۔

ایک مرتبہ میں کسی کام سے ندوہ روڈ پر واقع " پیام یونک کیسیٹ سریز سینٹر " گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ مفتی صاحب اپنی خاص وضع کے ساتھ ایک بینچ پر تشریف فرما ہیں، مالک دکان نے مفتی صاحب کی ضیافت کے لیے جو میسر تھا رکھ دیا، وہ کبھی اپنے کام میں مشغول ہو جاتے اور پھر " ماحضر " کی طرف دیکھتے بھی جاتے، مفتی صاحب کی حس ظرافت کو جنبش ہوئی اور فوراً بول پڑے: " گھبرائیے نہیں، پورا نہیں کھاؤں گا " وہ بیچارے شرما سے گئے۔

ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ مدارس کے ذمہ داران جو "حیلۂ تملیک " کرتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ مجھ سے جو جواب بن پڑا دے دیا، حسن اتفاق کہ کچھ ہی دیر بعد مفتی صاحب ظہر کی نماز پڑھ کر اپنے مخصوص انداز سے کمرے کی طرف جا رہے تھے، موقع غنیمت پا کر راستے ہی میں چلتے چلتے پوچھ لیا، جواب میں ارشاد فرمایا: " درست نہیں ہے " میں نے پوچھا: لیکن مفتی صاحب مدارس میں تو یہ ہوتا ہے ایک بیک رک گئے اور فرمایا: " تو کیا تم چاہتے ہو کہ ایک ناجائز چیز کو میں جائز کہہ دوں؟"

ان نمونوں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مفتی صاحب نے کیسی ظریفانہ طبیعت پائی تھی۔

یادش بخیر!

مفتی صاحب کی سادگی کا تذکرہ اس سے پہلے ہو چکا ہے اور یہی آپ کی شخصیت کا حسن ہے، سادگی کا عالم یہ تھا کہ آپ کو کہیں اور کسی کے ساتھ بیٹھنے میں عار نہ تھا، آپ ندوے کے کسی بھی ملازم کے ساتھ اس کی سائیکل پر بیٹھ جاتے تھے، وہ سعادت سمجھ کر آپ کو منزل تک چھوڑ آتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں نو وارد تھا، جاڑے کی یخ بستہ رات تھی! عشائیہ کے بعد تفریح کے لیے کمرے سے باہر نکلا، ندوے کے صدر دروازے کے پاس پہنچا تو کیا دیکھ رہا ہوں کہ دربانوں کے بیچ نیچے ہی فرش پہ بیٹھے ہوئے مفتی صاحب آگ تاپ رہے ہیں، میں سبھوں کو دربان سمجھ کر ذرا بے تکلفی کے ساتھ گذر رہا تھا کہ ایک قدیم ساتھی نے مجھے اشارہ کیا کہ مفتی صاحب بیٹھے ہیں ذرا احتیاط برتو میں نے مجسم حیرت اور سراپا استعجاب بن کر پوچھا: " مفتی صاحب اور یہاں؟"، ساتھی نے بتلایا، صرف مفتی ہی نہیں، صدر مفتی اور نائب مہتمم بھی ہیں، میں اللہ اکبر کہتا اور مفتی صاحب کو تکتا ہوا گزر گیا، اس وقت فوراً میرے ذہن میں " کندن لال گردھر " کا یہ شعر گھوم گیا:

کر حقارت نہ خرقہ پوشوں کی
گاہ گدڑی میں لعل ہوتے ہیں

شخصیتیں بہت پیدا ہوتی ہیں لیکن مفتی صاحب جیسی شخصتیں صدیوں بعد معدن انسانیت سے نکلا کرتی ہیں، " ایک گوشہ نشیں مجمع کمال، ایک بے نوا سلطان ہنر، دنیا کی دولت سے بے نیاز، اہل دنیا سے مستغنی، انسانوں کے رد و قبول اور عالم کی داد و تحسین سے بے پروا، گوشۂ علم کا معتکف، اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ " ہر روز آسانی سے نہیں پیدا ہوا کرتا مفتی صاحب چلے گئے وہاں جہاں ہر ایک کو اپنے اپنے وقتوں میں جانا ہے مگر وہ اپنے علم و اخلاص، فضل و کمال، پیار و محبت، لینت و مروت، اور

سادگی و بے تکلفی کی جنت سے ہمیشہ جھانکتے رہیں گے

" عالم بقا کے مسافر! تجھ پر رحمت! تیری روح پر رحمت، الوداع! السلام! تو جا چکا، مگر تو زبان حال سے کہتا گیا ع:

'ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم'

سوانحی نقوش

نام : (مفتی) محمد ظہور ندوی

وطن : مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

ولادت: ۱۹۲۷ء

ابتدائی وثانوی تعلیم :

ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے " ریاض العلوم " میں ہوئی پھر ثانوی تعلیم مبارکپور کے مدرسے " احیاء العلوم " میں شرح جامی اور شرح تہذیب تک درس نظامی کے مطابق حاصل کی۔

اعلی تعلیم اور فراغت :

؟؟۱۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے، اور ۱۹۵۰ء تک ندوۃ العلماء کے مشہور اور چوٹی کے اساتذہ سے اکتساب فیض کرتے رہے۔

تدریسی وعلمی اور ادارتی وانتظامی ذمہ داریاں :

فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں آپ کو اپنے جوہر چمکانے کا موقع ملا، یہاں تدریس کے ساتھ مختلف علمی وانتظامی مناصب پر بھی فائز رہے۔

(الف) دارالعلوم کے صدر مفتی بنائے گئے۔

(ب) نائب مہتمم کے منصب کو زینت بخشی۔

(ج) نائب ناظم کے منصب اعلی کو بھی عزت بخشی۔

۲۵/ستمبر ۲۰۱۶ء بروز اتوار بوقت صبح ۵ بجے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطے میں اللہ کو پیارے ہوگیے اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبز نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

چند مشہور اساتذہ

۱۔ حضرت مولانا ابوالعرفاں خاں ندویؒ

۲۔ حضرت مولانا اسحاق سندیلویؒ

۳۔ حضرت مولانا شاہ حلیم عطا سلویؒ

۴۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

۵۔ حضرت مولانا سعید صاحب ندویؒ

چند مایہ ناز تلامذہ

نصف صدی سے زائد عرصے سے آپ ندوۃ العلماء جیسے شہرۂ آفاق ادارہ اور علمی وفکری دانشگاہ سے وابستہ رہے، اس مدت میں طلباء کی بڑی تعداد نے آپ سے استفادہ کیا..... آپ کے نمایاں شاگردوں میں:

جناب ابوطفیل صاحب (پاکستان)

ڈاکٹر اجتباء ندوی مرحوم

مولانا ناصر علی ندوی رحمہ اللہ (سابق شیخ الحدیث، ندوۃ العلماء)

مولانا سید سلمان حسینی ندوی مدظلہ

جیسے آفتاب وماہتاب شامل ہیں

نوٹ : سوانحی نقوش کی ترتیب کے سلسلے میں استاذ محترم مولانا منور سلطان ندوی صاحب کی کتاب " ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابنائے ندوہ کی فقہی خدمات " میں فراہم کردہ معلومات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

☆☆☆

پیام سیرت

محبت کا امتحان

محمد فرید حبیب ندوی
Mob. 9012621589

''تم انہیں پہچانتے ہو، یہ کون ہیں، اگر چاہو تو ان کے ساتھ جا سکتے ہو''

مکہ کی جھلساتی دھوپ میں ایک نوخیز جوان کے سامنے یہ کلمات ادا کئے گئے۔

چشم فلک آج ایک نرالا اور انوکھا منظر دیکھ رہی تھی۔

انسانی تاریخ کا شاید سب سے عجیب منظر!!

ہر ایک انگشت بدنداں اور ہر کوئی متعجب وحیراں۔

یہ صرف ایک سوال اور استفسار نہ تھا۔

ایک تاریخ تھی ___ الفت بھری تاریخ ___ خون محبت سے لکھی تاریخ۔

اس کا جواب اتنا آسان نہ تھا، جتنا ہم سمجھتے ہیں۔

اس سوال کی سنگینی کا احساس مکہ کے ذرہ ذرہ کو تھا۔

مکہ کے در و دیوار اور کعبہ کے منبر ومحراب کی خاموشی اس کی اہمیت کا احساس دلا رہی تھی۔

ایک ایسا پر خطر سوال ___ جس کا جواب سالوں سال پر محیط تھا۔

کائنات پر سناٹا ___ مہیب سناٹا چھا گیا۔

ایسا سکوت ___ جس کی گھبراہٹ سے دل سینہ سے باہر نکلنے کو بے تاب ہونے لگے۔

خاموشی ___ سراپا خاموشی ___ کلیجہ کو پارہ پارہ کر دینے والی خاموشی۔

ہر ایک جواب کے لئے گوش بر آواز۔

مگر یہ تو لوگوں کا حال تھا ___ خود اس کا حال تو اس سے یکسر مختلف تھا۔

اس کے لئے تو ایسا تھا ___ جیسے دریا کی ایک موج ___ آئی اور گئی ___

''نہیں، میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا ___ آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا''۔

سکوت کا سینہ چیرتی ہوئی اس کی آواز بلند ہوئی، اور مجمع پر چھائی خاموشی خوشی میں تبدیل ہو گئی۔

''تم انہیں پہچانتے بھی ہو کہ یہ کون لوگ ہیں؟؟''

ایک دوسرا سوال ___

ایک اور آزمائش ہر طرح سے محبت کو آزمایا جا رہا تھا۔

خوشی ایک بار پھر حیرت واستعجاب میں تبدیل ہوتی ہے۔

''جی ہاں میں بالکل پہنچانتا ہوں، یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا''

تم ہمیں چھوڑ کر ان کے پاس رہنا چاہتے ہو؟ باپ آگے بڑھتا ہوا بولا۔

تم اپنے خاندان کو ٹھکراتے ہو؟؟ چچا بھی گویا ہوئے۔

''جی ہاں، میں سب کچھ ٹھکراتا ہوں، ان کے لئے میں آپ کو

بھی چھوڑ سکتا ہوں''

''ایسا کیا دیکھا ہے تو نے ان میں؟'' باپ کی زبان خاموش نہ رہ سکی۔

''پوچھتے ہو کہ میں ان میں کیا دیکھا ہے؟؟''

میں نے ان میں ماں کا پیار ___ ممتا کا دلار..... باپ کی شفقت.....دوست کی صداقت.....استاد کی محبت .....مرشد کی عظمت.....کیا کچھ نہیں دیکھا.....ایک ذات میں صد ہزار رنگ..... دیکھے ہیں میں نے۔

ان کی ذات پر سیکڑوں باپ قربان..... ان کے قدموں پر ہزاروں مائیں نچھاور۔

یہ تھے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کے پروردہ.....آپ کے متبنی .....منہ بولے بیٹے.....آپ کو جان سے زیادہ عزیز.....

بچپن میں ڈاکو اٹھا کر لے گئے تھے.....گردش ایام کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے آقائے نامدار کے دربار تک جا پہنچے.....اور پھر وہیں کے ہو رہے.....

کئی سال کے بعد اہل خانہ کو خبر ملی کہ مکہ میں فلاں شخص کے غلام ہیں۔

وہ لینے آئے.....مگر جس نے آفتاب جہاں تاب کی تابانیاں دیکھ لی ہوں.....جس نے نیر تاباں کی چمک دیکھ لی ہو.....

جس نے انسان نما فرشتہ دیکھ لیا ہو.....وہ اب اس سے دور کیسے جاتا!!

لہذا.....اس نے

آزادی پر غلامی کو

اہل خانہ پر اہل محبت کو

وطن پر پردیس کو

اور صلبی باپ پر روحانی باپ کو ترجیح دی۔

اور پھر جس نے محمد کے قدموں پر سر رکھا.....وہ اتنا بلند ہوا، اتنا بلند ہوا کہ عرش پر اس کے چرچے ہونے لگے..... زمین کی تہوں میں اس کا ذکر ہونے لگا.....سمندر کی مچھلیاں اسے یاد کرنے لگیں..... ہر زبان پر اس کا نام رہنے لگا۔

صحابہ میں اسے ہی یہ نعمت لا زوال نصیب ہوئی کہ وحی کے پردوں میں اس کے اسم مکرم کو اتارا گیا.....قرآن کے اوراق میں اسے سجایا گیا۔

اس کے نام کو دوام اور.....تا قیامت ابدیت عطا کر دی گئی۔

اس واقعہ میں دو سبق پوشیدہ ہیں!!

اس میں ایک طرف مالک اور آقا کی عظمت کا بیان ہے۔

غلام کے ساتھ اس کے حسن سلوک کا اشارہ ہے۔

ماتحت کے ساتھ اس کے برتاؤ کا ذکر ہے۔

اس میں رہنمائی ہے مالکوں کے لئے، آقاؤں کے لئے اور سرپرستوں کے لئے.....

اس میں درس ہے.....

نصیحت ہے.....اور پیغام ہے.....بالادستوں کے نام۔

دوسری طرف غلام کی سعادت مندی اور شرافت

اس کی وفاداری وجاں نثاری.....اطاعت وتابعداری

اس سے ظاہر ہوتی ہے.....

اس میں پیام ہے ماتحتوں کے لئے..... زیر دستوں کے لئے.....

مملوکوں اور غلاموں کے لئے۔

اور اس سب سے بڑھ کر.....اس کی سلوٹوں میں محبت ہے..... الفت ہے.....عقیدت ہے.....جس کی آج کی دنیا کو سب سے زیادہ ضرورت ہے.....

وہ جو محبت بانٹنے آیا تھا.....بلکہ جو محبت بن کر آیا تھا۔

وہ قبل از بعثت بھی درس محبت دیتا رہا..... پیام الفت عام کرتا رہا۔

کیا تاریخ آقا وغلام کے درمیان ایسی محبت وشفقت کی مثال پیش کر سکتی ہے.....؟؟؟

☆☆☆

نقطۂ نظر

دینی مدارس کی تعلیم اور عصر حاضر میں اسلام کی ترجمانی وتشریح کے تقاضے

(علامہ شبلی کے افکار کا مطالعہ)

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

دینی تعلیم مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا بنیادی اور سب سے ضروری جز ہے اور مدارس اس کے عظیم الشان مراکز ہیں۔ بر صغیر ہندو پاک میں دینی مدارس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ اس سرزمین میں مسلمانوں کی آمد، سکونت اور قیام حکومت کی تاریخ۔ ساتویں صدی عیسوی کے آخر سے جنوبی ہند میں عرب تاجروں کی اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ سکونت اختیار کرنے کے ساتھ مکاتب یا ابتدائی مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا تو سندھ میں اولین مسلم حکومت کے قیام کے بعد اسلام کی اشاعت اور دینی تعلیم کے فروغ کی راہیں مزید ہموار ہوئیں۔ تیرہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دہلی سلطنت کے قائم ہونے کے بعد نہ صرف دارالسلطنت دہلی بلکہ مختلف شہروں وقصبات میں کثرت سے دینی مدارس وجود میں آئے اور مغل دور میں مسلم حکومت کے حدود میں توسیع کے ساتھ یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا اور ملک کے مختلف حصوں میں دینی وعلمی سرگرمیوں میں کافی اضافہ ہوا۔ مغل بادشاہت کے خاتمہ کے بعد ملک کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھوں میں چلی گئی، لیکن اس انتشار، بدحالی اور پستی کی حالت میں بھی یہاں مدارس کا نظام قایم رہا اور دینی تعلیم کی اشاعت میں علماء کی کوششیں بدستور جاری رہیں اور الحمدللہ اب بھی یہ نیک سلسلہ بہت ساری رکاوٹوں اور آزمائشوں کے باوجود جاری وساری ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس ملک میں اسلام کی ضیا پاشیوں کے بعد اس کی تاریخ کا کوئی دور بھی ان بقاعِ خیر سے خالی نہیں رہا ہے۔ یہ بات خود ان اداروں کی اہمیت پر دلیل ہے کہ ملت کے خیر خواہ، دانشور اور مفکرین ہر دور میں ان کی اصلاح وترقی کے لئے کوشاں رہے ہیں اور ان کی افادیت بڑھانے خاص طور سے وقت کے تقاضوں سے انہیں ہم آہنگ کرنے کے لئے اپنے نتائجِ فکر پیش کرتے رہے ہیں۔ ان مفکرین میں علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ یہ برصغیر کی ان نامور شخصیات اور ممتاز دانشوروں میں سے تھے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ ملی وقومی فلاح وبہبود کے کاموں میں بسر ہوا۔ انہوں نے تعلیم کے مسئلہ میں خاص دلچسپی دکھائی۔ وہ مشرقی تعلیم میں رچے بسے تھے، عصری علوم پر بھی ان کی نظر تھی، مدارس اور جدید تعلیمی اداروں (بالخصوص اے۔او۔ کالج، ندوۃ العلماء اور مدرسۃ الاصلاح) کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کے نظام تعلیم وتربیت کو گہرائی سے سمجھنے کا اور بغور جائزہ لینے کا موقع ملا تھا۔ وہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر مسلسل غور وفکر کرتے رہتے

، وہ جہاں جاتے قدیم وجدید دونوں قسم کے اداروں کے نظامِ تعلیم وتربیت سے واقفیت حاصل کرنے میں بڑی دلچسپی لیتے، ان کی خوبیوں وخرابیوں کا پتہ لگاتے اور اصلاح کے امکانات کی نشاندہی کرتے۔ اس طرح تعلیم کے مسائل پر ان کی نظر بڑی وسیع و گہری تھی اور اس ضمن میں جو افکار وخیالات انھوں نے پیش کیے وہ ان کے وسیع مطالعہ، طویل تجربے اور تعلیمی منظرنامہ کے گہرے مشاہدے پر مبنی تھے [۲]۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ دینی مدارس مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے وہ بنیادی مراکز ہیں جن کا خاص مقصد ایسے باصلاحیت و با کردار افراد تیار کرنا ہے جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت، اسلامی شریعت کی تشریح وترجمانی، علومِ اسلامیہ کے فروغ، اسلام پر اعتراضات وشبہات کا دفاع اور مسلمانوں کے مذہبی وتہذیبی ورثہ کے تحفظ کے فرائض بحسن وخوبی انجام دے سکیں۔ علامہ شبلی نے اپنی تحریروں وتقریروں میں بار بار یہ حقیقت واضح کی کہ مدارس کے مذکورہ مقاصد کی تکمیل صحیح معنوں میں اسی وقت ممکن ہے جب دینی علوم میں مہارت پیدا کرنے کے اہتمام کے ساتھ عصری تقاضوں کے تحت نئے مضامین کی تعلیم کا نظم کیا جائے، ان کے نصاب وطرزِ تعلیم کو زمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے، طلبہ میں دعوتِ دین ودفاع اسلام کی صلاحیت پیدا کرنے اور داعی کی حیثیت سے ان کی شخصیت کی تعمیر پر خصوصی توجہ دی جائے۔ اس باب میں علامہ شبلی کے افکار کے جو خاص خاص نکات سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

☆ دینی مدارس کی بنیادی خصوصیات (علوم اسلامیہ میں اختصاص پیدا کرنا) کو ہر حال میں باقی رکھا جائے اور انھیں مستحکم کیا جائے۔

☆ نصاب میں قرآن کی درسیات کے حصہ کو اور بڑھایا جائے۔

☆ یہ زمانہ اختصاص کا ہے۔ امت کی رہنمائی اور اجتماعی مسائل کے حل کے لئے ہر میدان میں متخصصین کی ضرورت ہے۔ لہٰذا مدارس میں عام نصاب کی تکمیل کے بعد مختلف علوم میں اختصاص پیدا کرنے کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

☆ عصر حاضر میں وسیع پیمانہ پر اسلام کی ترجمانی وتشریح کا تقاضا یہ ہے کہ مدارس کے فضلاء السنۂ مشرقیہ کے ساتھ انگریزی اور دوسری مروجہ زبانوں سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ بہتر ہوگا کہ مدارس میں انگریزی زبان میں بھی اختصاص کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔

☆ دینی مدارس کے ایسے فضلاء کی ضرورت ہے جو اسلام پر جدید اسکالرس کے اعتراضات کو سمجھ سکیں اور اسلامی شریعت کے مسائل سے متعلق سرکاری عدالتوں اور دوسروں کی غلط ترجمانی پر ان کی نظر ہو۔ دوسرے اسلام، قرآن و پیغمبر ﷺ کے بارے میں کتب و رسائل اور میڈیا میں جو غلط بیانیاں ہوتی رہتی ہیں ان کو سمجھ کر نہ صرف یہ کہ لوگوں کو ان سے واقف کرائیں بلکہ مدلل انداز میں ان کی تردید بھی کرسکیں۔

☆ مدارس میں داعیانِ دین کی تعلیم وتربیت کے لئے مخصوص شعبہ قایم کیا جائے اور نصاب میں اس کی رعایت سے نئے مضامین شامل کئے جائیں۔

☆ کسی بڑے مدرسہ میں ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جس سے دعوت دین اور اشاعت اسلام کی خدمت انجام دینے والے اشخاص و ادارے منسلک ہوں تاکہ ان میں آپس میں ربط وتعاون کا سلسلہ رہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ علامہ شبلی وقت کے تقاضے کے تحت مدارس کے نصاب ونظام تدریس میں اصلاح وتبدیلی کے قائل تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان قدیم اداروں کی وقعت، اہمیت و افادیت کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہوئی۔ وہ دینی تعلیم یا مدارس

کے نظام کو مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی ریڑھ کی ہڈی تصور کرتے تھے۔خود ان کے الفاظ میں:

''یہی قوم کی وقعت وعظمت کا پہلا زینہ ہے،اس سے ان کی ذہنی، دماغی واخلاقی تربیت ہوتی ہے اور اسی کی بدولت اس کو ایسے لایق و قابل افراد ملتے ہیں جو اسے قعر ومزلت سے نکال کر بامِ عروج تک پہنچاتے ہیں'' ۳۔

مزید براں وہ اہلِ مدارس کے بارے میں صاف صاف کہتے تھے کہ اس طبقہ کا وجود اس قدر ضروری ہے کہ اگر یہ خدانخواستہ معدوم ہوجائے تو اسلام کے آثار دفعۃً مٹ جائیں اور ہزاروں لاکھوں اسکول اور کالج سے ان کی تلافی نہ ہوسکے گی۔اس لئے کہ ان سے مسلمانوں کی بہت سی مذہبی، تعلیمی، سماجی و ثقافتی ضروریات وابستہ ہیں۔علومِ اسلامیہ کی تدریس و ترویج، امامت، خطابت، مسائلِ شریعت کی تشریح و ترجمانی اور فتویٰ نویسی، یہ سارے امور انہی کے توسط سے انجام پاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ موجودہ شکل میں (یعنی بلاتبدیلی واصلاح) بھی قدیم مدارس کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے ۴۔

ان سب کے باوجود دینی مدارس کا جو نظام چل رہا تھا علامہ شبلی اس سے مطمئن نہیں تھے اور وہ بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کی موثر ترجمانی اور مسلمانوں کے سماجی، تہذیبی و ثقافتی مسائل سے بحسن وخوبی نبرد آزما ہونے کے لئے ان اداروں کے نصاب وتدریسی نظام میں اصلاح وترقی کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اس ضمن میں متعدد سوالات اٹھائے تھے:

اول یہ کہ دین اسلام پر اہل مغرب یا دوسرے جو اعتراضات کررہے ہیں ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے؟ اگر علماء ان سے واقف نہ ہوں گے یا انہیں نہ سمجھیں گے تو کیسے ان کا جواب دے سکیں گے اور کس طرح انگریزی خواں طبقہ یا جدید ذہن والوں میں ان کے خیالات کی اشاعت کو روکا جاسکتا ہے ۵۔

دوسرے یہ کہ غیر مسلموں کے مختلف طبقے خاص طور سے آریہ سماجی دیہاتی علاقوں میں سیدھے سادے مسلمانوں میں جس منظم طور پر اپنے خیالات کی تبلیغ کررہے ہیں اور ان میں فتنۂ ارتداد کو ہوا دے رہے ہیں کیا ان کے مقابلہ کے لئے مدارس کے ایسے فضلاء یا علماء کی ضرورت نہیں جو اسلامیات کے ساتھ ساتھ مقامی زبان سمجھتے ہوں اور سنسکرت سے بھی واقفیت رکھتے ہوں؟ ۶۔

تیسرے یہ کہ کیا مسلمانوں میں ایسے باصلاحیت افراد کی ضرورت نہیں جو عربی زبان و دینی علوم میں مہارت کے ساتھ انگریزی کی اچھی استعداد رکھتے ہوں تاکہ وہ انگریزی میں اسلامی لٹریچر تیار کرسکیں اور قرآن کریم اور حدیث و فقہ کی امہات کتب انگریزی و دوسری مروجہ زبانوں میں ترجمہ کرسکیں تاکہ انگریزوں یا غیر مسلموں کے تراجم (جو غلط تعبیرات و تشریحات سے خالی نہیں) پر انحصار کم سے کم ہوجائے؟

چوتھے یہ کہ اگر جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں قرآن سمجھنے کا شوق پیدا ہو وہ اسلامی فقہ کے احکام سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں، اگر انہیں مسلم اسکالرس کی کتابیں یا تراجم دستیاب نہ ہوں گے کہ تو کیا وہ سیل کے ترجمۂ قرآن اور ہملٹن کے ترجمۂ ھدایہ سے رجوع نہ کریں گے؟

پانچویں یہ کہ کیا موجودہ صورتحال میں امت کو ایسے فقہاء کی ضرورت نہیں جو اسلامی فقہ میں مہارت کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل سے متعلق سرکاری عدالتوں کے فیصلہ پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ان عدالتوں یا رسائل وجرائد میں اسلامی قانون کی جو غلط سلط ترجمانی ہے ان کی نشان دہی کرسکیں اور عالمانہ و محققانہ انداز میں اسلامی قانون کی صحیح تعبیر پیش کرسکیں؟ ۷۔

ان سوالات کی روشنی میں علامہ شبلی اپنے زمانہ کے مدارس کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر یہ پوچھتے ہیں کہ کیا یہ قدیم مدارس جدید ضرورتوں کے لئے بھی کافی ہیں؟ ان میں اب تک وہی قدیم نصاب ہے جو سو برس قبل تیار ہوا تھا اس پر ایک حرف کا بھی اضافہ نہیں ہوا ہے، تاریخ اسلام کی ایک کتاب بھی درس میں داخل نہیں ہے، تمام ہندوستان میں ایک شخص نہیں جو کسی خاص علم یا فن میں کمال کا درجہ رکھتا ہو۔ سینکڑوں ہزاروں علماء میں دو چار شخص بھی مشکل سے مل سکتے ہیں جو موجودہ انداز پر تحریر یا تقریر کر سکتے ہوں۔ نہ ان میں انگریزی زبان میں تعلیم ہوتی ہے، نہ جدید علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں، نہ نئے خیالات سے ان کو واقف کرایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تعلیم یافتہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات پر کیا اثر ڈال سکتے ہیں۔ علامہ شبلی کا یہ تاثر تھا کہ ان اداروں کے کچھ بنیادی مقاصد ہیں جن کی تکمیل سب سے پہلے درکار ہے۔ ان کے علاوہ مسلم معاشرہ یا ملی واجتماعی زندگی کی جو جدید ضروریات پیدا ہوگئی ہیں، وہ کیسے پوری کی جائیں اس کی طرف توجہ دینا بھی ضروری ہے۔ وہ اہلِ مدارس یا علماء سے مخاطب ہو کر یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ کیا وہ حال کے اعتراضات سے جو اسلام پر وارد ہوتے ہیں واقف ہیں، انہوں نے مخالفین اسلام کے خیالات سے واقف ہونے کے لئے کسی غیر زبان کی تعلیم حاصل کی ہے، کیا وہ اسلامی تاریخ کے ماہر ہیں، کیا سرکاری عدالتوں میں فقہ کے جن مسائل کی غلط تعبیر کی گئی ہے ان کی تصحیح کرتے ہوئے ان سے متعلق کوئی محققانہ مضمون تیار کر سکتے ہیں۸۔

دینی مدارس کی اس صورتحال کی روشنی میں ان کی اصلاح و ترقی یا ان کی افادیت بڑھانے کے لئے علامہ شبلی نے جو افکار پیش کئے ہیں وہ موجودہ دور میں بڑی اہمیت ومعنویت رکھتے ہیں، ان کے مطالعہ وتجزیہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ جدید دور میں اسلام کی بہتر وموثر تشریح وترجمانی کی ضروریات کے لحاظ سے طلبہ کی تعلیم وتربیت اور ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے پر کافی زور دیتے تھے اور نقطۂ نظر سے ان اداروں کے نصاب میں اصلاح وترمیم کے زبردست داعی تھے۔ اس ضمن میں ان کے افکار کو یہاں مختصراً پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

علامہ شبلی کا یہ احساس تھا کہ عظیم ترین کتابِ ہدایت کی حیثیت سے قرآن کریم کا جو مقام ومرتبہ ہے اور اسلامی علوم میں اسے جو بنیادی مقام حاصل ہے اس کے اعتبار سے مدارس کے نصاب میں اس کا حصہ بہت کم ہے۔ اس کی درسیات کو مزید بڑھانے اور اس کے لئے اور وقت فارغ کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ کتب تفسیر کے علاوہ ایسی کتابیں بھی شامل نصاب کی جائیں جن میں قرآن کے بنیادی مضامین واضح کئے گئے ہیں اور عقائد، احکام، اخلاق اور سیرتِ انبیاء سے متعلق قرآن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ان میں اجمالی طور پر مذکور ہو۔ اس کی وجہ سے قرآن کے بنیادی مضامین جامع انداز میں طلبہ کے سامنے آجائیں گے ۹۔

علامہ شبلی مختلف فنون کی اختصاصی تعلیم کے اہتمام کو کافی اہمیت دیتے تھے۔ ان کا تأثر تھا کہ یہ اختصاص (Specialization) کا دور ہے۔ متخصصین کی ضرورت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ ملت کی اجتماعی ضروریات اور اس کی فلاح و بہبود کے کاموں کے لئے مختلف علوم وفنون کے ماہرین درکار ہیں۔ اس لئے تعلیم کا ایسا نظام وضع کیا جائے کہ اس میں اعلیٰ مرحلہ میں اختصاصی تعلیم کا اہتمام ہو۔ طلبہ کی استعداد اور ان کے ذہنی رجحان کے اعتبار سے کسی خاص فن کے لئے انہیں تیار کیا جائے۔ اس طرح مختلف علوم وفنون کے

ماہر پیدا ہوں گے جو اپنے متعلقہ فن یا اختصاصی میدان میں نمایاں خدمت انجام دے سکیں گے۱۰۔

وقت کے تقاضے کے مطابق مولانا دینی علوم کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم کی افادیت کے قائل تھے۔ان کا بہت ہی واضح موقف تھا کہ بدلتے ہوئے حالات میں اس کے بغیر دعوتِ دین اور دفاع اسلام کی خدمت بخوبی نہیں انجام دی جا سکتی۔وہ کہتے تھے کہ مذہبی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کی ضرورت ہے۔موجودہ فلسفہ کا مقابلہ علوم جدیدہ کی واقفیت کے بغیر کیوں کر ہوسکتا ہے۱۱ ، یورپ میں اسلام کی اشاعت انگریزی دانی کے بغیر کیوں کر ہوسکتی ہے،آریوں اور عیسائیوں کے مذہبی حملوں کا دفاع انگریزی جانے بغیر کیوں کر ہوسکتا ہے۔وہ نہ صرف عربی درجات میں شروع سے آخر تک انگریزی زبان کی تعلیم درسیات میں شامل کئے جانے پر زور دیتے تھے بلکہ وہ عام نصاب کی تکمیل کے بعد دو برس کے اختصاص کے مرحلہ میں خواہش مند طلبہ کے لئے انگریزی میں بھی اختصاص کی سہولتیں مہیا کرنے کے حق میں تھے۱۲۔وہ اس پر افسوس ظاہر کرتے تھے کہ قرآن مجید کے مطالب اور رسول اکرم ﷺ کے حالات جارج سیل اور ولیم میور کی کتابوں سے اخذ کئے جاتے ہیں۔اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس کے علاوہ اور کیا صورت ہے کہ علوم اسلامیہ کے اسکالرس انگریزی زبان میں بھی مہارت حاصل کریں۔یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا نے اسی خیال کے مطابق جب ندوۃ العلماء میں انگریزی زبان کی تعلیم کو بحیثیت لازمی مضمون کے شامل کیا تو ان شاگردِ رشید مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان سے یہ دریافت کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں ان کو انگریزی کیا کام آئے گی تو مولانا نے فرمایا کہ

''عجیب بات کہتے ہو۔اگر فقہاء انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ھدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کئے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے'' ۱۳۔

مدارس میں انگریزی زبان کی تعلیم کے معقول نظم کے علاوہ علامہ شبلی نے ان اداروں کی تعلیم کو مزید مفید و کارگر بنانے کے لیے اس پر زور دیا کہ ہندی و سنسکرت، جدید فلسفہ اور علوم طبیعیہ کی کتابیں بھی داخل نصاب کی جائیں اور انھوں نے ندوۃ العلماء میں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی ۱۴۔ان سب کے علاوہ ان کی یہ رائے بھی بہت اہم تھی کہ نئی صورت حال کے تحت مدارس میں طریق تعلیم و تدریس کو تبدیل کیا جائے۔جدید دور کے تقاضوں کی روشنی میں طلبہ کو نئے علوم سے بھی روشناس کرایا جائے اور نظام تعلیم کی دوئی کو ختم کر کے قدیم صالح اور جدید نافع کے امتزاج کے طریقہ کو اپنایا جائے۔تعلیم کے دونوں نظام (قدیم و جدید) میں اصلاح و ترمیم کے لیے مفید و مناسب تجاویز پیش کرنے کے علاوہ علامہ شبلی نے اس نکتہ پر خاص زور دیا کہ مسلمانوں میں دونوں قسم کی تعلیم کی ترویج کی ضرورت ہے۔دونوں تعلیم کے فیض یافتگان ملت کے ضروری اجزاء ہیں، انہیں آپس میں دست و باز و ہو کر کام کرنا چاہئے تا کہ دونوں کی صلاحیتیں اجتماعی مفاد کے کاموں میں صرف ہوں اور دونوں اپنے اپنے طور پر مفید خدمات انجام دے سکیں ۱۵۔

آخر میں علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کے اس قیمتی پہلو کی طرف بھی اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کی ایک بہت بڑی غرض و غایت یہ ہے کہ دین کی دعوت اور اسلامی احکام و تعلیمات کی تشریح و ترجمانی کے لیے افراد تیار ہوں یعنی

مسلمانوں کی تعلیم کا نظام اس طور پر مرتب کیا جائے کہ اس کے فیض سے ایسے باصلاحیت افراد پیدا ہوں جو نہایت خوش اسلوبی سے دعوت دین کا فریضہ انجام دے سکیں اور اسلام و اسلامی اقدار کی موثر ترجمانی کر سکیں۔ان میں ایسی اہلیت نشو و نما پائے کہ وہ اسلام پر اعتراضات کا مدلل انداز میں جواب دے سکیں اور عصری تقاضوں کے مطابق صحیح و مستند مذہبی لٹریچر تیار کر سکیں۔علامہ شبلی نے اپنی تحریروں میں تعلیم کے ان مقاصد کی تکمیل پر جو زور دیا اس کا ایک خاص پس منظر تھا، اس وقت ملک کے مختلف حصوں میں آریوں کی تحریک زوروں پر تھی، انھوں نے خاص طور سے دیہی علاقوں میں اپنے مذہبی عقاید و رسوم کی تعلیم و تبلیغ کا جال پھیلا رکھا تھا، نومسلموں میں اسلام کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنا اور اسلام کے خلاف ورغلانا ان کی سرگرمیوں کا نہایت اہم پہلو تھا۔بقول علامہ شبلی اس تحریک کے رہنما اپنی جاں فشانی، ایثار نفسی، قناعت وخود داری سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے،ان کے واعظین و مبلغین بڑے تعلیم یافتہ اور سادہ طرز زندگی اور فقیرانہ روش اختیار کرتے تھے، وہ گاؤں گاؤں میں پھرتے تھے، چنے چبا کر پیٹ بھر لیتے تھے اور رات کو درخت کے نیچے سو رہتے تھے ۔ اپنے زمانہ کے مخصوص حالات میں وہ آریوں کے ان اوصاف سے بہت متاثر تھے اور وہ یہ برملا بیان فرماتے کہ مسلم معاشرہ میں بھی ایسے جفاکش، ایثار پسند اور مخلص علماء کی ضرورت ہے جو دیہات میں پھیل جائیں اور اطراف میں اپنے مستقل تعلیمی و تبلیغی مراکز قائم کریں [۱۶]۔اس مقصد کے تحت علامہ شبلی نے مدارس میں جن امور کے اہتمام پر خاص زور دیا وہ یہ تھے:

☆ عربی دانوں کے لیے انگریزی و سنسکرت زبان کی اعلیٰ تعلیم کا اہتمام۔

☆ مدارس میں مبلغین و دعاۃ کی تربیت کے لیے شعبۂ اشاعت وحفاظتِ اسلام کا قیام۔

☆ مختلف اضلاع میں اس شعبہ کی شاخیں قائم کر کے مستقل واعظین مقرر کرنا تاکہ وہ دیہاتوں میں ایک ایک دو دو مہینہ رہ کر اسلامی عقاید واحکام کی تعلیم دیں اور خاص طور سے نو مسلموں میں وہ دعوت وتربیت کا کام کریں۔

☆ مستقل واعظین و مبلغین کا نظم نہ ہونے تک اس کا ایک عارضی متبادل نظم قائم کیا جائے اور اس کے لیے ائمہ وموذنین کو تربیت دی جائے۔ان کے لیے اردو کا برس دو برس کا کورس بنایا جائے اور اردو پڑھنے والے نوجوانوں کو قرآن پاک کے ساتھ اردو میں مسائل و عقائد کی سادہ تعلیم دے کر دیہاتوں کی مسجدوں میں پھیلا دیا جائے۔ یہ مسجدوں میں بچوں کو تعلیم بہم پہنچائیں اور لوگوں میں اسلام کی تبلیغ بھی کرتے رہیں [۱۷]۔

علامہ شبلی نے نہ صرف یہ کہ مدارس میں اشاعتِ اسلام کا ایک مستقل شعبہ قائم کرنے پر زور دیا جس میں دعاۃ وواعظین کی تیاری وتربیت کا بخوبی اہتمام ہو بلکہ کسی بڑے مدرسہ میں ایک ایسے مذہبی مرکز کے قیام کی طرف بھی ملت کے بہی خواہوں کو متوجہ کیا جس سے دعوتِ دین اور دفاع اسلام کی خدمت انجام دینے والے تمام افراد وادارے منسلک ومربوط ہوں تاکہ ایک متفقہ قوت کے ساتھ اسلام کی اشاعت، الحاد کے رد اور مخالفین اسلام سے مقابلہ کا کام انجام پا سکے۔ان کا خیال تھا کہ سینکڑوں مذہبی کام چھڑے ہوئے ہیں لیکن چوں کہ یہ منتشر اور ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں اس لئے کوئی بڑا کام انجام نہیں ہو پاتا اور نہ لوگوں پر ان کا خاطر خواہ اثر ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ایک مذہبی مرکز کی سخت

ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ اگر حکومت کسی معاملہ یا مسئلہ میں مسلمانوں کی مشترکہ رائے معلوم کرنا چاہتی ہے تو اس کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اس طرح ایک مذہبی مرکز کے قیام سے مسلمانوں کی فکری قوتیں مجتمع ہو جائیں گی، اجتماعی مسائل کے حل کے لئے اقدام میں آسانی ہو گی۔ مزید براں در پیش مسایل میں اس مرکز کے توسط سے حکومت سے رجوع کرنے میں ان کی آواز بااثر ثابت ہوگی ۱۸۔

علامہ شبلی صرف گفتار کے نہیں بلکہ کردار کے بھی غازی تھے انھوں نے ندوۃ العلماء میں اپنی تجاویز کو ابتدائی شکل میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اور صیغۂ اشاعت وحفاظت اسلام کے نام سے ۱۹۰۸ء میں ایک علیٰحدہ شعبہ قائم کیا۔ اس کے سکریٹری مولانا شاہ سلیمان پھلواروی مقرر ہوئے، لیکن بعض وجوہ سے اس شعبہ کا کام آگے نہیں بڑھ سکا۔ پھر انھوں نے اسی مقصد سے ندوہ سے باہر ایک مجلسِ اشاعت وحفاظت اسلام قائم کی اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کو شریکِ ناظم کے طور پر مقرر کیا۔ انھوں نے اس کی سرگرمیوں کو کافی آگے بڑھایا، جس میں نومسلموں کی مردم شماری، ان کے احوال و کوائف کے باب میں معلومات کی فراہمی، ان کی آبادیوں میں احکام اسلام کی ترویج و اشاعت کا اہتمام اور مضامین، خطوط، اشتہارات و پمفلٹ کے ذریعہ مسلمانوں میں ان کے مسائل کے تئیں بیداری پیدا کرنا اور ان تمام کاموں کے لیے اہل علم و اصحاب خیر سے تعاون کی دردمندانہ اپیل کرنا شامل ہیں۔ یہ تمام کام علامہ شبلی کی نگرانی و ہدایت میں انجام پاتے رہے ۱۹۔ ان سب سے مقصود یہ تھا کہ ایک ایسا مرکز وجود میں آئے جہاں ایسے داعیان دین تیار ہوں جو مذہبی و مشرقی تعلیم کے ساتھ علاقائی زبانوں اور عصری مضامین سے بخوبی واقف ہوں تا کہ اسلام کی اشاعت اور علمی سطح پر آریہ مبلغین سے مقابلہ کے لیے وہ مفید و کارگر ثابت ہوں، ان کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اس مرکز کے زیر اہتمام دیہات وقصبات کی نومسلم آبادی میں احکام اسلام کی ترویج کا اہتمام کیا جائے۔

دین کی دعوت اور اسلام کے دفاع کے لیے با صلاحیت افراد تیار کرنے سے متعلق ان تجاویز و اقدامات سے قطع نظر علامہ شبلی مبلغینِ اسلام (جنھیں وہ خدام الدین کہتے تھے) کی تربیت کے پورے نظام کو مدارس سے منسلک کرنے کے حق میں تھے۔ درحقیقت وہ خدام الدین کی تربیت کو مدارس کے نظام کا ضروری جز بنانا چاہتے تھے اور اس مقصد سے ان کی درسیات اور طریقہ تدریس میں مناسب ترمیم و اضافہ بھی چاہتے تھے۔ مدارس میں عربی و فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی و سنسکرت کی تعلیم پر زور دینے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ان اداروں کے طلبہ مختلف پہلو سے دین کی خدمت اور اسلام کی تبلیغ و ترجمانی کے لیے تیار ہو جائیں۔ آریوں سے مقابلہ کے لیے اور ان کی تحریک کے خطرات کے ازالہ کے لیے علامہ شبلی کے ذہن میں مبلغین کی ایسی جماعت کا نقشہ تھا جو محنتی و جفاکش ہو، ایثار و قناعت جیسے اوصاف سے متصف ہو اور سادہ مذہبی زندگی میں رچی بسی ہو۔ اس باب میں وہ اس خیال کے حامل تھے کہ دیہات کے کسی مدرسہ کو خدام الدین کی تربیت کا مرکز بنایا جائے تو زیادہ بہتر و مفید رہے گا ۲۰۔ خدام الدین کی تیاری کے لیے ان کی نظر سب سے پہلے مدرسۃ الاصلاح پر پڑی جو اس وقت مجلس اصلاح المسلمین سے مدرسہ کی صورت میں منتقل ہو کر مولانا حمید الدین فراہی کی سرپرستی میں مولانا محمد شفیع کے زیر نظامت ترقی کے منازل طے کر رہا تھا۔ یہ مدرسہ سرائے میر (اعظم گڑھ) کے قریب ایک دیہی علاقہ میں تھا اور

اپنی سادگی واصول پسندی کے لیے معروف تھا، انھوں نے اپریل ۱۹۱۰ء میں مولانا فراہی کے نام ایک خط میں یہ تجویز رکھی کہ اس مدرسہ کو ''گروکل'' کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے یعنی سادہ زندگی اور قناعت و مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔ مولانا فراہی کے نام علامہ شبلی کے خط کا یہ حصہ بہت ہی مشہور ہے اور اکثر اس کا حوالہ دیا جاتا ہے:

''کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو اور میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم ونسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو''۲۱۔

یہ قطعی طور پر معلوم نہیں کہ مولانا فراہی نے اس کا کیا جواب دیا لیکن یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ان دنوں علامہ شبلی خدام الدین کی جماعت کے قیام کے تئیں بہت سنجیدہ وسرگرم تھے اور وہ جلد از جلد کسی مدرسہ میں اس کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے، چنانچہ ندوۃ العلماء میں انھوں نے اس کی بنیاد ڈال دی، کچھ طلبہ اس کام کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کو باقاعدہ اس جماعت میں داخل کرنے سے قبل ان کے والدین کی رضا مندی بھی حاصل کی۔ ان طلبہ کے لیے روزمرہ زندگی کا یہ اصول وضع کیا گیا کہ وہ کھانے پینے اور رہن سہن میں سادگی اختیار کریں گے، زمین پر سوئیں گے اور احکام اسلامی کی پوری پابندی کے ساتھ تقویٰ وقناعت کی زندگی کو اپنا شعار بنائیں گے۲۲۔ خدام الدین کی تربیت کا یہ سلسلہ جنوری ۱۹۱۲ء کے شروع میں قائم ہوا، اس کے تقریباً ایک ماہ بعد مولانا فراہی کے نام خط میں اس جماعت کے قیام پر اظہار مسرت کرتے ہوئے مختصراً اس کی کارکردگی بیان فرمائی اور یہ امید بھی ظاہر کی کہ تربیت کے بعد یہ طلبہ دیہات میں اشاعت اسلام کے لیے کارگر ثابت ہوں گے۲۳۔ ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے علامہ شبلی کی علیٰحدگی کے بعد ظاہر ہے کہ خدام الدین کی تربیت کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن اس کی ضرورت وافادیت ان کے ذہن میں اس قدر رچ بس گئی تھی کہ وہ اس سے غافل نہ رہے۔ ندوہ کی ذمہ داری سے سبک دوشی کے بعد جب انھوں نے اعظم گڑھ کو اپنی مصروفیات کا مرکز بنایا تو پھر ان کے ذہن میں یہ خیال تازہ ہوا کہ مدرسۃ الاصلاح میں خدام الدین کی تربیت کا اہتمام کیا جائے اور اس مدرسہ کے نظام کو اس نہج پر ڈھالا جائے کہ یہ ایسے باصلاحیت داعیانِ دین کی تیاری کا مرکز بن جائے جو بہتر وموثر انداز میں اسلامی اقدار وتعلیمات کی تشریح وترجمانی کی خدمت انجام دے سکیں اور اسلام مخالف سرگرمیوں کا تدارک کر سکیں۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا فراہی کے نام ان کے تحریر کردہ خط سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ سرائے میر (مدرسۃ الاصلاح) یا اعظم گڑھ (دارالمصنفین) کسی ایک کو ایسا مرکز بنایا جائے کہ اس میں دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے اعلیٰ تعلیم کا اہتمام ہو۔ خدام الدین کی تربیت کا باقاعدہ نظم ہو اور ایک معقول کتب خانہ بھی قائم ہو۲۴۔

مسلمانوں کی تعلیم، مدارس کے نظامِ تعلیم وتربیت اور تعلیم کو بامقصد بنانے سے متعلق علامہ شبلی کی ان تجاویز کی اہمیت و افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ان کی آخر الذکر تجویز (خدام الدین کی تیاری کو مدارس کے نظام تعلیم وتربیت کا ضروری جز بنایا جائے) ابھی منصوبہ بندی یا عمل آوری کے ابتدائی مرحلہ میں تھی کہ وہ ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو گئے (اللھم اغفر وارحم وانت خیر الراحمین) اور ان کے اپنے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی تعلیم کا بہت ہی جامع تصور رکھتے تھے، ان کی نظر میں تعلیم نہ صرف یہ کہ ہر شخص کی انفرادی زندگی کی تعمیر وترقی کا بہترین وسیلہ ہے بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بہت سی ضروریات اس سے وابستہ ہیں۔ اسی لیے وہ مسلمانوں کے لیے مختلف علوم وفنون کے اکتساب کو ضروری سمجھتے تھے اور ان کے لیے تعلیمی نظام کی تشکیل میں عصری تقاضوں کی رعایت کو کافی اہمیت دیتے تھے۔ ان سب کے علاوہ مذکورہ مباحث سے ان کے تعلیمی افکار کا ایک بہت اہم پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مخصوص حالات اور غیر مسلم مبلغین کی ریشہ دوانیوں کے پیش نظر مسلمانوں کے تعلیمی نظام بالخصوص مدارس کے تعلیمی سلسلہ کو ایک عظیم مقصد سے مرتبط کرنا چاہتے تھے اور وہ تھا اسلام کی تبلیغ واشاعت، اسلامی احکام وتعلیمات کی بہتر تشریح وترجمانی اور اسلام مخالف عناصر سے مقابلہ (یا فی الجملہ دین کی خدمت) کے لیے باصلاحیت مخلص، محنتی وجفاکش افراد تیار کرنا، اس میں کوئی دورائے نہیں کہ وہ مدارس کو ان افراد کی تعلیم وتربیت کا بہترین مرکز سمجھتے تھے اور اس نقطہ نظر سے ان کی تعلیم وتربیت کے نظام میں اصلاح وترقی کی جانب اہل مداس کو بار بار متوجہ کرتے رہے۔ بلا شبہ برصغیر کے موجودہ حالات اور ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کے سیاق میں علامہ شبلی کے یہ افکار بڑی اہمیت ومعنویت رکھتے ہیں اس لیے کہ موجودہ صورت حال میں مسلم معاشرہ کو مختلف علوم وفنون خاص طور سے اسلامی وعصری علوم کے ماہرین کی ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسلام واسلامی نظامِ حیات پر نئے نئے اعتراضات وشبہات سامنے آرہے ہیں، قرآن کریم، پیغمبر آخر الزماں ﷺ اور شریعت اسلامیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے اور اس کام میں "الکفر ملة واحدة" کے اصول پر تمام مخالف قوتیں مجتمع اور انتہائی سرگرم ہوگئی ہیں۔ ایسے سنگین حالات میں اسلام کے دفاع اور دین کی خدمت میں منہمک ہوجانے والوں کی ضرورت کس قدر بڑھ گئی ہے وضاحت کی محتاج نہیں۔ واقعہ یہ کہ علامہ شبلی نے اپنے زمانہ کی صورت حال میں اس بات پر خاص زور دیا کہ مسلمانوں کے لیے نہ صرف مشرقی تعلیم کافی ہے اور نہ محض جدید تعلیم سے آراستہ ہونا ان کی انفرادی واجتماعی زندگی کی ضرورت کو پورا کرسکتا ہے بلکہ ان کے لیے ایک ایسا تعلیمی نظام درکار ہے جو مرکب ہو مشرقی و عصری تعلیم سے ۲۵۔ علامہ شبلی کے اس نقطۂ نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ نے بجا فرمایا ہے:

"دراصل وہ دین ودنیا کی خلیج پاٹنا اور قدیم وجدید کا ڈانڈا ملانا چاہتے تھے، کیوں کہ ان کے نزدیک موجودہ دور میں نہ محض قدیم تعلیم سے مسلمانوں کے مسائل اور ضرورتوں کا حل ممکن ہے اور نہ صرف جدید تعلیم ہی ان کے دکھ درد کی دوا ہے۔ دونوں کے مجموعے اور آمیزش ہی میں ان کے مسائل اور پریشانیوں کا علاج ہے" ۲۶۔

آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علامہ شبلی نے دینی مدارس کے نصاب سے متعلق اپنے تأثرات اب سے تقریباً سو برس قبل ظاہر کئے تھے اور انہوں نے اہلِ مدارس یا علماء سے مذکورہ بالا سوالات ایک صدی قبل اٹھائے تھے ۲۷۔ اس میں شبہ نہیں کہ اب حالات کافی بدل چکے ہیں۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق بہت سے مدارس کے نصاب اصلاح و ترمیم کے مراحل سے گذرتے رہتے ہیں اور آج مدارس کے فارغین میں ایسے اسکالرس ودانش ور پائے جاتے ہیں جو مسلم معاشرہ کی جدید ضروریات پوری کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں،

وہ جدید انداز و اسلوب میں اسلام کی تشریح و ترجمانی کرتے رہتے ہیں اور اسلام پر اٹھائے جانے والے اعتراضات و شکوک کو رفع کرنے کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ لیکن علامہ شبلی نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان پر مزید غور و فکر درکار ہے اور ان کی روشنی میں ان اداروں کے نظام تعلیم و تربیت کو مزید مستحکم و مفید بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے عصری آگہی درکار ہے اور وقت کے مطالبات کو سمجھنا بھی ضروری ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ قرآن و سنت سے تعلق کی مضبوطی از حد ضروری ہے، اس کے بغیر ہمارا کوئی مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے۔ اللہ کرے ہمیں اس کی توفیق نصیب ہو۔

حواشی و مراجع

۱۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں راقم کی کتاب: تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء (باب اول ۔ عہد سلطنت کے مدارس اُ ایک جائزہ) ص ۱۸۔۴۳

۲۔ ضیاءالدین اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۶ء (باب۔۹ مولانا شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات) ص ۱۳۰۔۱۳۲

۳۔ مسلمانوں کی تعلیم، محولہ بالا، ص ۱۳۰

۴۔ خطباتِ شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی)، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء، ص ۶۱۔۶۲؛ مقالات شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی) مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ۱۴۲/۳۔۱۴۳

۵۔ مقالات شبلی، ۱۴۲/۳

۶۔ خطبات شبلی، ص ۹۶۔۹۷

۷۔ خطبات شبلی، ص ۶۰، ۶۳

۸۔ حوالۂ مذکور، ص ۶۳، ۹۵۔۹۶

۹۔ حوالۂ مذکور، ص ۲۶۔۲۷

۱۰۔ مقالات شبلی، ۱۲۹/۳؛ خطبات شبلی، ص ۲۵، ۵۰، ۹۶

۱۱۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۶ء ص ۲۰۔۲۱؛ خطبات شبلی، ص ۶۰، ۹۳، ۹۵

۱۲۔ خطبات شبلی، ص ۶۴

۱۳۔ حیات شبلی، محولہ بالا، ص ۱۳۵

۱۴۔ خطبات شبلی، ص ۹۵، ۹۶، ۹۷؛ مسلمانوں کی تعلیم، ص ۱۵۳۔۱۵۴

۱۵۔ مقالات شبلی، ۱۴۲/۳۔۱۴۳، ۱۴۸؛ خطبات شبلی، ص ۶۱۔۶۳، ۸۷

۱۶۔ حیات شبلی، ص ۵۶۱۔۵۶۲

۱۷۔ حیات شبلی، ص ۵۶۲۔۵۶۴؛ خطبات شبلی، ص ۹۶۔۹۸

۱۸۔ خطبات شبلی، ص ۹۸

۱۹۔ حیات شبلی، ص ۵۶۵۔۵۶۶

۲۰۔ مسلمانوں کی تعلیم، ص ۱۵۷۔۱۵۸

۲۱۔ مکاتیب شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی)، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء، ۳۳/۲ (مکتوب نمبر۔۵۰)

۲۲۔ حیات شبلی، ص ۷۶

۲۳۔ مکاتیب شبلی، ۳۶/۲ (مکتوب نمبر۔۵۵)

۲۴۔ مکاتیب شبلی، ۴۶/۲۔۴۷ (مکتوب نمبر۔۶۸)

۲۵۔ مقالات شبلی، ۱۶۳/۳

۲۶۔ مسلمانوں کی تعلیم، ص ۱۸۰

۲۷۔ خطبات شبلی، ص ۶۱۔۶۳

☆☆☆

خصائص وامتیازات (قسط-۸)

امت محمدیہ، خصوصیات وامتیازات

محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ
maeducationalsociety@gmail.com

پندرھویں خصوصیت: امت محمدیہ بھوک اور قحط سالی کی وجہ سے ہلاک نہیں ہوگی:

یہ بھی خدائے وحدہ لاشریک کا اس امت کے ساتھ ایک خاص فضل وکرم بلکہ خصوصی احسان ہے کہ امتِ محمدیہ خشک سالی اور قحط سالی، بھوک مری اور ڈوب کر ہلاک نہیں ہوگی۔ اور گذشتہ اقوام وملل اور سابقہ امتوں کی طرح اس کو عذاب میں مبتلا نہ کیا جائے گا۔ اور نہ ہی ان کے اوپر کوئی ایسا دشمن مسلط کیا جائے گا جو اس کو صفحۂ دہر اور صفحۂ ہستی سے مٹادے اور اس کا وجود ختم کردے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا إن اللہ تعالی زوی لی الارض مشارقها ومغاربها وان امتی سیبلغ ملکها ما زوی لی منها..... (مسلم شریف باب هلاك هذه الأمة بعضهم ببعض)

اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو لپیٹ لیا یعنی ساری زمین کو سمیٹ کر میرے سامنے کردیا تو میں نے اس کا مشرق اور مغرب دیکھا، اور میری حکومت وہاں تک ہوگی جہاں تک زمین مجھ کو دکھلائی گئی اور مجھ کو دو خزانے ملے سرخ اور سفید۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ میری امت کو عام قحط سالی سے ہلاک نہ کرے، اور ان پر کوئی غیر دشمن ایسا غالب نہ ہو کہ ان کا جتھا ٹوٹ جائے اور اس امت کی جڑ کٹ جائے (یعنی پوری طرح سے یہ امت نیست ونابود نہ ہوجائے) میرے پروردگار نے فرمایا: اے محمد ﷺ میں جب کوئی حکم دیتا ہوں پھر وہ حکم نہیں پلٹتا اور میں نے تیری یہ دعائیں قبول کیں۔ میں تیری امت کو عام قحط سے ہلاک نہیں کروں گا نہ ان پر کوئی غیر دشمن جو ان میں سے نہ ہو ایسا غالب کروں گا جو ان کے وجود کو ختم کردے اور ان کی جڑ کاٹ دے، اگر چہ زمین کے لوگ اکھٹے ہوجائیں مسلمانوں کو تباہ وبرباد کرنے لئے، پر ان کے اندر یہ طاقت نہ ہوگی کہ ان کو بالکل تباہ کردیں۔ یہاں تک کہ خود مسلمان ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے کو قید کریں گے۔

ابوداؤد ابواب الفتن میں ایک دوسری حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم کو بچادیا ہے تین باتوں سے ایک تو یہ ہے کہ تمہارا نبی اور رسول تم پر بددعا کرے پھر تم سب ہلاک ہوجاؤ، دوسری یہ کہ اہل باطل حق والوں پر کبھی غالب نہ

ہوں گے تیسری یہ کہ تم سب گمراہ نہ ہوگے۔(ابوداؤد، ابواب الفتن)۔

سولھویں خصوصیت: حضرت عیسی علیہ السلام امت محمدیہ کے فرد ہوں گے

امتِ محمدیہؐ کے فضائل ومناقب میں سے یہ بھی ایک اہم فضیلت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ (۱) اپنی نبوت کے ساتھ ایک امتی بن کر قیامت سے قریب آسمان سے اتریں گے بلکہ بعض علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ صحابی ہیں اس لئے کہ ان کی ملاقات آنحضرت ﷺ سے بحالتِ ایمان ہوئی ہے۔

احادیث میں اس کا تذکرہ موجود ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جب بیت المقدس میں اتریں گے تو وہ صبح کا وقت ہوگا۔ امام نماز پڑھانے کے لئے مصلی پر کھڑے ہو جائیں گے۔لیکن جب وہ حضرت عیسی علیہ السلام کو دیکھیں گے تو پیچھے ہٹنے لگیں گے۔ پھر حضرت عیسیٰؑ کا حکم ہوگا کہ آپ ہی نماز پڑھائیں تو پھر وہی پڑھائیں گے۔اس کے بعد دجال کو قتل کریں گے اور اس کے فتنے سے روئے زمین کو پاک کریں گے۔ابن ماجہ شریف میں یہ روایت موجود ہے۔

اذا نزل عليهم عيسى ابن مريم الصبح فرجع الإمام ينكص، يمشي القهقرىٰ، ليتقدم عيسىٰ يصلي بالناس، فيضع عيسىٰ يده بين كتفيه ثم

(۱) حضرت عیسی علیہ السلام کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ بغیر باپ کے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان کو پیدا فرمایا، ان کی والدہ حضرت مریم پر جب ان کی قوم نے الزام لگایا، تو معجزہ کے طور پر پیدائش کے بعد ہی حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنی والدہ کی پاک دامنی اور عصمت کو بیان کیا کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں مجھے کتاب ''انجیل'' عطا فرمائی ہے۔ مجھے نماز پڑھنے اور زکوۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے، بنی اسرائیل میں اس وقت مشرکانہ عقائد بغض وحسد اور روحانی بیماریاں عام ہوگئی تھیں۔اللہ کے اُحکام میں تبدیلی کرتے، انبیاء کی مخالفت کرتے، ان کی بدبختی یہاں تک پہنچ گئی کہ رسولوں کے قتل سے بھی نہیں ڈرتے تھے، ایسے ماحول میں حضرت عیسیٰ ﷺ نے اس قوم کو ایک اللہ کی عبادت واطاعت کرنے اور اس کو اپنا رب ماننے اور سیدھا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دی اور فرمایا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے جو کتاب ''توراۃ'' نازل فرمائی تھی میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس بات کی خوش خبری دیتا ہوں کہ میرے بعد تمام رسولوں کے سردار آخری نبی آنے والے ہیں جن کا نام ''احمد'' ہوگا، تم ان پر نازل ہونے والی کتاب ''قرآن کریم'' پر ایمان لانا اور ان کو سچا رسول جاننا، جو ان کے دین پر چلے گا وہی کامیاب ہوگا، جن لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کو قبول کیا ان کو حواری کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو بہت سے معجزے عطا فرمائے تھے مثلاً بغیر باپ کے پیدا ہونا، پیدائش کے بعد ماں کی گود میں ان کی پاکدامنی کی گواہی دینا، باذن خدا تعالیٰ مردوں کو زندہ کرنا، اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دینا، مٹی سے پرندہ بنا کر پھونک مار کر اڑا دینا، لوگوں کے گھر میں رکھی ہوئی چیزوں کا بتا دینا، ان کی دعا سے آسمان سے دسترخوان کا اترنا، زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا، قیامت کے قریب دنیا میں دوبارہ تشریف لانا، یہ وہ معجزات ہیں جس کی شہادت قرآن پاک نے دی ہے۔جب حضرت عیسیٰؑ نے لوگوں کو توحید وایمان کی دعوت دینی شروع فرمائی، تو آپ کی محبت وعقیدت اور قبولیت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا، مگر یہودی اس دعوت وشہرت کو اپنے لئے بڑا خطرہ سمجھنے لگے اس لئے انہوں نے بادشاہِ وقت کو اپنا ہم خیال بنا کر قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، جس مکان میں آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھی موجود تھے، اس کو گھیر لیا، موقع پا کر آپ کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر زندہ اٹھا لیا اور ایک یہودی کو آپ کا ہم شکل بنا دیا جس کو لوگوں نے پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا اور یوں سمجھا کہ ہم نے عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھا دیا۔حضرت عیسیٰؑ قیامت سے پہلے اپنی نبوت کے ساتھ ایک امتی بن کر آسمان سے اتریں گے جو اس امت کے لئے شرف کی بات ہوگی۔(م۔ق۔ن)

یقول له تقدم فصل۔ (ابن ماجه ٤٠٧٧)

خلاصہ یہ کہ ایک رسول ہو کر اس امت میں امتی بن کر شامل ہوں گے جو اس امت کے لئے شرف کی بات ہوگی۔ اس سے پہلے کوئی رسول ایسے نہیں ہوئے جن کی امت میں خود کوئی رسول شامل ہوئے ہوں۔ اور اپنی شریعت چھوڑ کر دوسرے رسول کی شریعت پر ان کا عمل رہا ہو۔ گو حضرت موسیٰ نے اس کی تمنا ضرور فرمائی تھی لیکن سعادت اور خوش نصیبی حضرت عیسیٰؑ کے حصہ اور قسمت میں آئی۔

بخاری اور مسلم میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عیسیٰؑ تم میں انصاف پسند حاکم بن کر نازل ہوں گے اور وہ صلیب کو توڑیں گے۔ خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ کو ختم کر دیں گے۔

قال رسول الله والذی نفسی بیده لیوشکن أن ینزل فیکم ابن مریم حکما مقسطا، فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر، ویضع الجزیة ویفیض المال حتی لا یقبله احد، (بخاری شریف)۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

جمہور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب نازل ہوں گے اور دجال کا خاتمہ کریں گے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہو جائے گا تو روضۂ اطہر میں آپ کی تدفین ہوگی۔ مگر ذہن میں بہت سے لوگوں کے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور ﷺ خاتم النبی ہیں اور آپؐ کے بعد کوئی نبی یا رسول نہیں ہے تو پھر حضرت عیسیٰؑ کیسے نازل ہوں گے؟ کیا یہ ختم نبوت کے خلاف نہ ہوگا؟ یہ ایک اہم سوال ہے اور منکرین ختم نبوت بھی یہی سوال کر کے لوگوں کو گمراہ کرنے کی اپنی سی کوشش کیا کرتے ہیں، اس لئے اس کا جواب اور اس شبہ کا ازالہ بہت اہم اور ضروری ہے۔ علماء نے اس پر بھی تشفی بخش گفتگو کی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض ایک وسوسہ ہے، علمی اعتبار اور لحاظ سے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

مختصراً یہ کہ روز اول اللہ تعالیٰ نے یہ طے کر دیا تھا کہ انسانیت کی رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً انبیاء ورسل کو مبعوث فرمائے گا۔ یہ سب اللہ کے علم میں اور اس کے فیصلے کے مطابق طے شدہ تھا کہ کون کون حضرات نبی یا رسول ہیں اور کس کو کس قوم یا علاقے کے لئے مبعوث فرمائے گا۔ یہ بھی فیصلہ تھا کہ سب سے پہلے نبی ورسول حضرت آدم علیہ السلام ہوں گے اور آخر میں مکمل شریعت کے ساتھ حضور نبی کریم ﷺ کو خاتم النبیین بنا کر ساری انسانیت کا نبی قرار دے کر مبعوث کیا جائے گا۔ پہلے ہر علاقے اور قوم میں اس نے اپنے منتخب بندوں کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا، پھر سب سے آخر میں آپ ﷺ کو خاتم النبیین کی حیثیت سے مبعوث فرما کر یہ اعلان بھی کر دیا کہ اب دین مکمل کر دیا گیا اور یہ کہ محمد ﷺ خاتم النبیین اور آخری نبی اور رسول ہیں، ان کے بعد ایسا کوئی انسان پیدا نہ ہوگا جسے نبی یا رسول بنایا جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق سب جانتے ہیں کہ وہ بنی اسرائیل کے نبی بنا کر اپنے وقت پر مبعوث کیے گئے تھے اور ان کی پیدائش اور بعثت چھ سو سال پہلے ہو چکی تھی۔ پھر بنی اسرائیل کے لئے بھی ان کی دعوت ضروری نہیں رہی۔ اب ساری قوموں کے لئے آنحضرت ﷺ ہادی اور رہنما ہیں لہذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول صرف قیامت کی ایک علامت اور دجال کے خاتمے کے لئے ہوگا، نہ نبوت کی کوئی دعوت ان کے ذمہ ہوگی نہ وہ دوبارہ بنی اسرائیل یا کسی اور کے ہادی ورہنما ہوں گے۔ چونکہ آپ کی پیدائش اور بعثت حضور ﷺ سے پہلے

ہوچکی تھی اس لئے دوبارہ نزول ختم نبوت کے منافی ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس نزول کے بعد آپ دعوت نبوت کے لیے نازل ہوتے تب تو یہ شبہ ہوسکتا تھا، مفسرین نے آیت خاتم النبیین کی تفسیر میں عام طور سے خاتم النبیین کا یہی مفہوم بتایا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کے بعد اب کسی کو نبوت عطا نہ کی جائے گی اس کے ساتھ ہی نزول عیسیٰؑ پر جو شبہ ہوتا ہے اس کے ازالہ کے طور پر وہیں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ چونکہ حضرت عیسی کی ولادت اور بعثت حضور ﷺ سے پہلے ہوچکی تھی اس لئے ان کا نزول ختم نبوت کے منافی ہرگز نہیں ہے، منافی تو اس صورت میں ہوتا جب آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ نبی بنائے جاتے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔ (ملخص کالم دین فطرت انقلاب جمعہ میگزین ۲۴/اکتوبر)۔

سترھویں خصوصیت: نبی اکرم رسول عربی ﷺ کی قبر کی تعیین:

آنحضرت ﷺ سے پہلے جتنے بھی انبیاء کرام اور رسولان عظام اس دنیا میں تشریف لائے ان کی قبروں کی تعیین نہیں ہے۔ شک وشبہ کے ساتھ ہی ان کی تعیین کی جاتی ہے، قطعیت کے ساتھ اور پورے وثوق ویقین کے ساتھ تعیین کرنا مشکل ہے۔

لیکن اس امت کے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس کے نبی ﷺ کی قبر یقین کے ساتھ مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ جس کے بارے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے جبکہ دیگر انبیاء کرام کی قبروں کی تعیین کے بارے میں کوئی قطعی شہادت اور ثبوت موجود نہیں ہے۔

امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جانب اپنے شعر میں اشارہ کیا ہے۔ کہ

ولم تعلم مقابرهم بارض
يقينا غير ما سكن الرسول

(ترجمہ: آنحضرت ﷺ کے مزار اقدس کے علاوہ دیگر انبیاء کی قبروں کی جگہ یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔)

آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی تعیین کے ساتھ ساتھ آپؐ کی پاک بیویوں کی قبر کی تعیین بھی ہے۔

ایک مرتبہ امیر المومنین مہدی سے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا جب بھی آپ کا گذر مدینہ منورہ سے ہو تو ہر آنے جانے والوں کو سلام کیجئے۔ کیوں کہ وہ مہاجرین کی اولاد ہیں۔ اور روئے زمین پر مدینہ والوں سے بہتر کوئی قوم نہیں ہے۔ اور نہ ہی مدینہ سے بہتر کوئی شہر ہے۔ امیر المومنین نے پوچھا یہ بات آپ نے کہاں سے کہی۔ تو امام مالکؒ نے فرمایا روئے زمین پر آنحضرت ﷺ کی قبر اطہر کے علاوہ کسی نبی کی قبر کی تعیین نہیں ہے، اور چونکہ آپؐ کی قبر مبارک مدینہ میں ہے اس وجہ سے مدینہ اور مدینے والے سب سے افضل اور بہتر ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ صبح اور شام ستر ہزار فرشتے روضۂ مبارک پر اترتے ہیں۔ اور قبر اطہر کو گھیر لیتے ہیں اور اپنے پروں کو کھول دیتے ہیں اور درود بھیجتے ہیں۔

اٹھارویں خصوصیت: امت محمدیہ کا تذکرہ دیگر آسمانی کتابوں میں:

اس امت کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس امت کا تذکرہ دیگر آسمانی کتابوں میں بھی آیا ہے۔ چنانچہ سورۂ فتح آیت ۲۸ میں آنحضرت اور صحابۂ کرام کی چار خصوصیات کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔

پہلی خصوصیت بیان کرتے ہوئے قرآن نے کہا۔ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر

سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرنے والے ہیں۔

دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ "وتراهم ركعاً سجداً" (اے مخاطب تو ان کو اس حال میں دیکھے گا کہ کبھی رکوع کئے ہوئے ہیں کبھی سجدہ کئے ہوئے ہیں) اس میں کثرت سے نماز پڑھنا اور نمازوں پر مداومت کرنا، نوافل کا اہتمام کرنا، راتوں کو نماز میں کھڑا ہونا سب شامل ہے۔

تیسری صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"يبتغون فضلا من الله" (یہ حضرات اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی تلاش کرتے ہیں) یعنی اس امت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس امت کے لوگ جو اعمال اختیار کرتے ہیں ان کے ذریعہ کوئی دنیاوی مقصد نہیں ہوتا بلکہ ان کے اعمال اللہ کا فضل تلاش کرنے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہیں۔

چوتھی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا "وسيماهم في وجوههم من اثر السجود" اس کا مطلب بتاتے ہوئے مفسرین نے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں۔ صاحب معالم التنزیل نے اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ مٹی پر سجدہ کرنے کی وجہ سے ان کے ماتھوں پر مٹی لگ جاتی ہے ظاہری لفظوں سے بھی یہ سمجھ میں آرہا ہے۔ اور بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن ان لوگوں کے چہرے روشن ہوں گے ان کے ذریعہ پہچانے جائیں گے کہ یہ لوگ نماز پڑھنے میں زیادہ مشغول رہتے تھے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے اچھی عادت وخصلت اور خشوع وخضوع مراد ہے۔ جو لوگ کثرت سے نماز پڑھتے ہیں، انہیں جو نماز کی برکات حاصل ہوتی ہیں ان میں سے ایک بڑی صفت خوش خلقی اور تواضع بھی ہے ان کے چہروں سے ان کی یہ صفت واضح ہوجاتی ہے۔ (مستفاد انوار البیان ج۸ ص۳۷۶)

پھر فرمایا "ذلك مثلهم في التوراة" ان کی مذکورہ صفت توریت میں بھی بیان کی گئی ہے۔ تورات میں آنحضرت ﷺ کی مبارک آمد کا ذکر کرتے ہوئے صحابہ کے لئے "قدوسیوں" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ، اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی، وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں اور تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں تیری بات مانیں گے''۔

فاران مکہ کے پاس پہاڑ کا نام ہے۔ اور شہر مدینہ کے پاس، اس کے سوا اگر صحابہ کرامؓ کی کوئی صفت تورات میں بیان ہوئی تھی تو وہ اب موجودہ محرف تورات میں نہیں ملتی۔ فتح مکہ کے وقت دس ہزار صحابہؓ حضور ﷺ کی رفاقت میں فاران سے طلوع ہونے والے اس نورانی پیکر کے ساتھ شہر خلیل میں داخل ہوئے۔

پھر انجیل میں جو ان کی صفت بیان کی گئی ہے اس کو بیان فرمایا: "مثلهم في الإنجيل كزرع أخرج شطأه" کہ انجیل میں ان لوگوں کی مثال یہ ہے کہ جیسے کسان نے نرم زمین میں بیج ڈالا، اس زمین سے کھیتی کی سوئی نکلی، یعنی ہلکا بہت پتلا تنا ظاہر ہوا، پھر یہ آگے بڑھا تو اس میں قوت آگئی پھر اور آگے بڑھا تو موٹا ہوگیا، ان حالتوں سے گزر کر اب وہ ٹھیک طریقے سے اپنی پنڈلی پر کھڑا ہوگیا، اب یہ ہرا بھرا بھی ہے، اندر سے نکل کر بڑھ بھی چکا ہے، اور اس کا تنا اپنی جڑ پر کھڑا ہے، کسان لوگ اسے دیکھ کر خوش ہورہے ہیں۔

اس مثال میں یہ بتادیا کہ محمد ﷺ کے صحابہ اولاً تھوڑے سے ہوں گے پھر بڑھتے رہیں گے اور زیادہ ہو جائیں گے اور مجموعی حیثیت سے وہ ایک بڑی قوت بن جائیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرات صحابہ کرام پہلے تھوڑے تھے پھر بڑھتے رہے بڑھتے بڑھتے ہزاروں ہوگئے، زمانہ نبوت میں ایک لاکھ سے زیادہ ان کی تعداد ہوگئی پھر انھوں نے دین اسلام کو خوب پھیلایا، قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ دیئے، ان کے مقابلہ میں کوئی جماعت جم نہیں سکتی تھی۔(انوار القرآن ج۱۰ص ۳۴۱)

انیسویں خصوصیت: امت محمدیہؐ کے روزے داروں کے ساتھ خصوصی انعام:

فضائل اعمال میں روزہ داروں کی ایک اہم خصوصیت یہ بیان کی گی ہے، کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: کہ میری امت کو رمضان شریف کے بارے میں پانچ چیزیں بطور خاص دی گئی ہیں۔

(۱) یہ کہ ان کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔(۲) یہ کہ ان کے لئے دریا کی مچھلیاں تک دعا کرتی ہیں اور افطار کے وقت تک کرتی رہتی ہیں۔(۳) جنت ہر روز آراستہ کی جاتی ہے پھر حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ قریب ہے کہ میرے بندے دنیا کی مشقتیں اپنے اوپر سے پھینک کر تیری طرف آویں۔(۴) اس میں سرکش شیاطین قید کردیے جاتے ہیں کہ وہ رمضان میں ان برائیوں کی طرف نہیں پہنچ سکتے جن کی طرف غیر رمضان میں پہنچ سکتے ہیں۔(۵) رمضان کی آخری رات میں روزہ داروں کے لئے مغفرت کی جاتی ہے صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ شب مغفرت شب قدر ہے، فرمایا نہیں بلکہ یہ دستور ہے کہ مزدور کو کام ختم ہونے کے وقت مزدوری دیدی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس حدیث پاک میں پانچ خصوصیتیں ارشاد فرمائی ہیں جو اس امت کے لئے حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے مخصوص انعام ہوئیں اور پہلی امت کے روزہ داروں کو مرحمت نہیں ہوئی، کاش ہمیں اس نعمت کی قدر ہوتی۔ اور ان خصوصی عطایا کے حصول کی کوشش کرتے۔(فضائل اعمال جلد اول فضائل رمضان)۔

بیسویں خصوصیت : اس امت کو ایک ایسی رات دی گئی جس کا ثواب هزار راتوں سے زیادہ هے :

امت محمدیہؐ چونکہ پہلی امتوں کے مقابلے میں جسمانی طاقت کے اعتبار سے کمزور ہے اور اس کی زندگی نسبتاً کم ہوتی ہے، اس لئے وہ اپنی جسمانی کمزوری اور کم عمری کی وجہ سے اللہ کی عبادت و بندگی میں سابقہ امتوں کی برابری نہیں کرسکی تھی، لہذا اللہ تعالیٰ نے اس پر خصوصی عنایت اور رحم وکرم کا معاملہ فرما کر شب قدر عطا کی اور اس کی خیر و برکت اور خصوصیت کو بیان کرنے کے لئے سورۂ قدر کے نام سے ایک پوری سورت نازل فرمائی اور دیگر مواقع پر بھی قرآن میں اس کی اہمیت کو واضح کیا۔ مفسر قرآن مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تحقیق کے مطابق، اس سورت کے شان نزول کے سلسلے میں جتنی روایات آئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ صحیح روایت وہ ہے، جو موطا امام مالک میں مرسلاً ذکر کی گئی ہے، امام مالکؒ لکھتے ہیں۔ ''میں نے ایک قابل اعتماد عالم سے سنا ہے وہ کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی امت کی عمریں چوں کہ تھوڑی ہیں اس لئے دوسری امتوں کے اعمال کی تعداد کے برابر تو ان کے اعمال نہیں ہو سکے، کیوں کہ ان کی عمریں زیادہ تھیں۔ اس لئے اللہ پاک نے رسولؐ کو شبِ قدر عطا فرمائی، جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''

(......جاری) ☆☆☆

فکر اسلامی

(قسط-۸)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

حق و باطل کی کشمکش :

تحریک اخوان المسلمین ابتدا سے ہی اپنے بلند مقاصد کے سبب دشمنان اسلام کا ہدف بنی رہی ہے، آج جن لوگوں نے اسے خالص سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا ہے وہ شاید پورے طور پر اپنا نقطۂ نظر واضح اور درست نہ قائم کرسکیں، اس لیے کہ یہ تحریک قدیم ہے، مکمل اسلام کی نمائندگی اس کا ہدف ہے اور اس کا ماضی نہایت اذیت ناک اور قربانیوں سے مزین ہے، اس لیے اس کی موجودہ سیاسی صورت حال کو دیکھنے کے لئے ان لوگوں کو اس کے ماضی میں جانا چاہئے، ۱۹۵۱ء کے اپنے مصر کے سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا تحریر کرتے ہیں:۔

''۲۷/ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ (۱۴ فروری ۱۹۵۱ء) کو قاہرہ کی عدالت فوجداری میں اخوان کا مقدمہ پیش تھا اور سعید رمضان صاحب کو وکیل صفائی کی حیثیت سے بحث کرنی تھی، راقم نے بھی اپنے رفقاء اور مصری احباب کے ساتھ خصوصی اجازت سے عدالت کے کمرے میں داخل ہونے اور بیٹھنے کا موقع حاصل کرلیا، انھوں نے مقدمہ کو بڑی مؤثر تقریر اور بے مثال جرأت کے ساتھ پیش کیا، حق و باطل کی قدیم جنگ آزمائی اور نبوی تعلیمات سے شیاطین کی ازلی کشمکش پر روشنی ڈالی، آخر میں یہودیوں کی اسلام دشمنی، ان کے منصوبوں اور عالم اسلام کے لئے پیدا ہونے والے خطرات پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے بتایا کہ ان خطرناک حالات میں تحریک اخوان المسلمین وجود میں آئی اور اس نے اس صورت حال سے نبرد آزمائی کی، اس سے عدالت کا ماحول دینی فضا سے بدل گیا اور حاضرین کے دلوں پر رقت وخشیت طاری ہوگئی، انھوں نے جب اس سلسلہ کی احادیث وآیات پڑھیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور عدالت کے گوشوں سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں۔'' (کاروان زندگی ج۶ ص۱۳۵)۔

مسلم ممالک کی کشمکش:

بلاد اسلامیہ میں مولانا کا متعدد بار جانا ہوا اور وہاں کے مسائل پر گفتگو کرنے کا بھی موقع ملتا رہا، ۱۹۹۵ء میں رابطہ کی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے جو کچھ کہا اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مولانا پر امریکہ کے عربوں پر بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور اسرائیل کی ریشہ دوانیاں بہت کھل کر واضح ہوچکی تھیں بلکہ اس کے مقابلہ میں عربوں کی دفاعی بلکہ مرعوبیت اور غلامی کی فکر سے لبریز پالیسی کا بھی انکشاف ہوچکا تھا، مولانا کی اس تقریر کا ایک اقتباس دیکھئے:

''اس صورت حال سے اسلامی ممالک کے سیاسی تعلیمی، فکری و تمدنی قائدین میں ایک غیر ضروری حساسیت (SENSITIVENESS) اور (ELERGY) پیدا ہوگئی تھی جس کی وجہ سے دونوں طبقوں کی توانائیاں اور

صلاحیتیں اس معرکہ آرائی میں صرف ہو رہی ہیں، نہ حکومتیں مسلمانوں کی اکثریت وعوام کو اپنے اثر میں پورے طور پر لاسکی ہیں اور نہ ان ملکوں کا سواد اعظم اور دینی قائدین اہل اقتدار اور فکری وتمدنی قائدین کو قوت اور وقت کی اضاعت اور بے محل نبرد آزمائی سے بچنے اور اصل نشانہ پر کوشش کرنے پر آمادہ کر سکے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان عوام اور اسلامی ملکوں کی آبادی اپنی اصل طاقت سے محروم ہوتی جارہی ہے جو حیرت انگیز کارناموں اور محیر العقول فتوحات اور کامیابیوں کا باعث تھی، یعنی جہاد وشہادت کی فضیلت سے واقفیت اور اللہ کی رضا اور اجر وثواب کی امید، جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

ولا تهنوا في ابتغاء القوم ان تكونوا تألمون فانهم يألمون كما تألمون وترجون من الله مالا يرجون وكان الله عليما حكيما (سورة النساء ١٠٤) (اور دیکھو دشمن کا پیچھا کرنے میں ہمت نہ ہارو، اگر تمہیں (جنگ میں) دکھ پہونچتا ہے تو جس طرح تم دکھی ہوتے ہو وہ بھی (تمہارے ہاتھوں) دکھی ہوتے ہیں، اور تمہیں (ان پر فوقیت یہ ہے کہ) تم اللہ سے کامیابی اور اجر کی ایسی امیدیں رکھتے ہو جو انھیں میسر نہیں اور اللہ جاننے والا اور اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے)۔

اس بناء پر اس وقت اسلامی، دعوتی، فکری، اور تعلیمی قیادتوں اور مرکزوں کا سب سے ضروری کام یہ ہے کہ (چاہے ان کا حجم ورقبہ چھوٹا اور ان کے سامنے کتنے ہی موانع ومشکلات ہوں) کہ وہ اپنے ملکوں اور معاشروں کو اس قیادتی، فکری اور تنقیدی تمدنی اور سیاسی معرکہ آرائی سے بچانے کی کوشش کریں جو بے وقت بھی ہے اور بے ضرورت بھی اور مغرب کے نفوذ اور اس کی سلبی منصوبہ بندیوں اور سازشوں سے بچانے کی کوشش کریں، مسلمانوں کے سینوں اور دلوں میں اب بھی جو طاقت ودیعت ہے اور ایمان کی جو چنگاری چھپی ہوئی ہے اور جس نے دنیا میں محیر العقول کارنامے انجام دیے ہیں، جس نے بارہا ناممکن کو ممکن بنادیا ہے اور جو اپنی ایجابی وتعمیری طاقت اور قوت ووسعت میں ایٹم بم (ATOM BOMB) سے زیادہ طاقتور اور محیر العقول ہے اس کو زندہ کرنے کی کوشش کریں اور یہ آیت ان کے سامنے رہے:۔

والذين كفروا بعضهم اولياء بعض الا تفعلوه تكن فتنة فى الارض وفساد كبير (سورة الانفال ٧٣) اور جو لوگ منکر حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں، اگر تم نے اس کے مقابلہ میں خود ایک وحدت نہ بنائی تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو جائے گا"

(کاروان زندگی۔ج۔٦ص۔٢١٩۔٢٢١)

مغرب سے اسلامی ممالک کو آزاد کرانے میں سب سے اہم نکتہ:

یہ بات مسلّم ہے کہ جیسا نظام تعلیم ہوتا ہے ویسے ہی اثرات قوم پر پڑتے ہیں، نظام تعلیم کو جس طرح مغرب نے جکڑ رکھا ہے اس کے سبب ایک بڑے تعلیم یافتہ طبقہ کا اسلام پر ہر دور میں قیادت کرنے سے اعتماد اٹھتا جارہا ہے اور زیادہ سے زیادہ اس کے نزدیک بعض شعائر دین ہی اسلام میں رہ گئے ہیں، یہ صورت حال اس قدر عام ہوگئی ہے کہ اب کوئی ملک ایسا نہیں رہا جہاں کل اسلام کی بات کی جاتی ہو، ملک مسلم، حکومت مسلم، آبادی مسلم، اسکول مسلم، اساتذہ مسلم لیکن مغرب نے ایسا نظام تعلیم مسلط کیا ہے کہ فکر اسلام کے تابع نہیں، اس لیے بس بعض ظاہر وضروری شعائر کو اپنا کر ہی اپنے کو مکمل مسلمان سمجھا جاتا ہے، چنانچہ مولانا نے ترک وزیر اعظم نجم الدین اربکان

صاحب کو خط لکھا اور اس میں یہ وضاحت کی:۔

''سب سے بنیادی قدم جو اٹھایا جانا چاہئے جو منظم بھی ہو اور مصمم بھی، اور ایسا انقلاب انگیز ہو جس کی اس محبوب قوم اور ملک کو ضرورت ہے، اور جو اس کو اسکے پہلے مرکز قیادت تک پہونچا دے، وہ یہ ہے کہ اس قوم کو خاص طور سے اس طبقہ کو جو تعلیم یافتہ اور مثقف اور یونیورسٹیوں کا ساختہ و پرداختہ ہو، اور جس کے ہاتھ میں زمام قیادت آنے والی ہو، اس کو یوروپ وامریکہ کی غلامی سے آزاد کرایا جائے، جس کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ اس کو لادینیت اور مغربی مسیحیت کے پھندے سے خلاصی دلائی جائے اور اس پر جو عقلی، تمدنی تہذیبی اور تنظیمی مغربی چھاپ ہے اس کو زائل کیا جائے، جس تہذیب کے نتیجہ میں نئی تعلیم یافتہ نسل اپنی معنوی قوت، جوش وجذبہ اور قربانی کی روح سے عاری ہوگئی ہے اس کے اندر مادی آرائش وزیبائش سے مقابلہ کرنے اور سیاست کی عقلی وتمدنی سازشوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے''۔(کاروان زندگی ج۶ص۲۹۷)۔

قومی ضمیر پر موت طاری:

۱۹۶۷ء کے افسوس ناک المیہ سے مولاناؒ پر جو اثر ہوا اس نے ان کی زبان حق ترجمان سے بہت کچھ کہلوایا، اس وقت مولاناؒ کی زبان سے جو جملے ادا ہوئے آج ان کی معنویت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے، اس وقت عالم عربی ہی نہیں خود ہندوستان کی صورت حال کچھ ایسی ہی ہے کہ گویا قومی ضمیر خواب خرگوش میں مبتلا ہے یا پھر حس نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے، اس پر طرہ وطرفہ یہ ہے کہ اگر کسی نے حالات کی سنگینی پر زبان کھول دی اور حقائق بیان کر دیے تو لوگ اس کے در پہ ملامت واستہزاء ہو گئے، قومی مسائل اور اہم مسائل کی تنقید کو شخصی مسئلہ بنا دیا، اس طرح کا دفاعی انداز اور مصلحت پسندی یا خاموشی کس طرح زیب ہے؟؟ کہ مصر میں اسلامی تحریک (خواہ کسی کا اس سے نظریاتی اختلاف ہی کیوں نہ ہو) کو اکھاڑ پھینکا گیا، اور سعودی عرب نے اس پر خوشی کے شادیانے بجائے، غیرت اسلامی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا گیا اور ہمارے قلم وزبان نے احتساب کے لئے حرکت بھی نہ کی، احتساب تو دور صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے کی ہمت بھی نہ ہوئی، مولاناؒ فرماتے ہیں:۔

''میں ان جیسے المیوں سے کوئی خطرہ نہیں محسوس کرتا بلکہ مجھے اصل خطرہ اس ضمیر سے ہے جس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہے، ضمیر کا کام ہے احتساب اور غلطیوں کی گرفت، خواہ وہ اپنے باپ اور بھائی سے سرزد ہوئی ہو یا کسی ذی وقار پیشوا اور رہنما سے، اگر یہ ضمیر مردہ ہو جائے اپنا فطری عمل چھوڑ دے، اپنی افادیت کھو بیٹھے، اور اس میں حقائق کے اعتراف کی صلاحیت باقی نہ رہ جائے، تو یہ سب سے بڑا خطرہ ہے، یہ انسانیت کی موت ہے، ایک انسان مرتا ہے تو ہزاروں انسان پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن جب ضمیر مردہ ہو جائے، اجتماعی اور قومی ضمیر سے زندگی کے آثار ناپید ہو جائیں، جب قوم سے محاسبہ کی صلاحیت اور جرأت ختم ہو جائے، جب تنقید واحتساب کی جگہ شاباشی، اور داد وتحسین کے پھول برسنے لگیں تو یہ ایسا المیہ ہوگا جس کے بعد کسی المیہ کا تصور ہی ممکن نہیں۔''(عالم عربی کا المیہ ص۱۱۸۔۱۱۹)۔

یہی نہیں آگے اور وضاحت سے فرماتے ہیں:۔

''سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا خطرہ تو یہ ہے کہ یہ ضمیر اپنا کام کرنا بند کر دے، اور یہ صرف عرب کے لئے یا صرف مسلمانوں کے لئے خطرہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے خطرہ ہے کیونکہ اللہ نے اسی مسلم ضمیر ہی کو اپنے رازوں کا امین بنایا ہے اس نے ہر مسلمان کو دنیا کا متولی اور ہمیشہ کے لئے عدل وانصاف کا میزان بنایا ہے، جو کامل احتیاط اور ایمانداری

کے ساتھ اور پوری جرأت و بے باکی کے ساتھ فیصلہ کرے، کسی فرد کی رعایت نہ کرے اور نہ کسی کو کسی پر ترجیح دے، لیکن جب یہ میزان ہی اپنا کام چھوڑ دے تو پھر عدل و انصاف کی توقع کس سے کی جائے، جب نمک اپنی نمکینی ضائع کر دے تو آپ ہی بتلائیں کھانا کس چیز سے نمکین کیا جائے؟ یہاں یہ مصیبت نہیں کہ کھانا نمکین نہیں ہے بلکہ مصیبت یہ ہے کہ نمک کی نمکینی جاتی رہی، مصیبت یہ ہے کہ عدل و انصاف کی میزان سے کار کردگی کی صلاحیت ختم ہوگئی، وہ غیر جانبدار نہیں رہی، کسی کی دوست ہوگئی تو کسی کی دشمن۔'' (عالم عربی کا المیہ ص ۱۲۱۔۱۲۲)

قیادت کا محاسبہ کیجئے:

حقیقت یہ ہے کہ جب قومی و ملی مسائل میں سیاستدانوں اور حکمرانوں کا احتساب کرنا قوم بند کر دیتی ہے تو وہ مطلق العنان ہو جاتے ہیں، شاہی نظام تو نام ہی ہے مطلق العنانیت کا، اگر چہ اس پر اسلامیت اور مصنوعی و برائے نام شوری کی خوبصورت چادر ڈالی جائے لیکن دور رہ کر، آزاد ملک میں رہ کر، ایک ملت کے فرد کی حیثیت سے جب کچھ لوگوں نے موجودہ کشمکش میں بعض عرب ممالک کا احتساب کرنا چاہا تو بہت سے لوگ چیں بہ جبیں ہو گئے، جب کہ ان کا جرم ایسا تھا کہ ان سے مجرموں کا سا معاملہ کیا جاتا، انھوں نے اسلام کی تاریخ کو داغدار کرنے کا کام کیا تھا، ملت اسلامیہ کا سر شرم سے جھکا دیا تھا، لیکن اب بھی ان کی عقیدت ان کا احترام سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

اگر قیادتوں کا احتساب نہ کیا گیا تو حالات کا یہ رخ خراب تر ہوتا جائے گا، حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کی ہمت پیدا کرنی پڑے گی، کیونکہ ہمارے عقیدے کے مطابق ملت کا ادنیٰ سا مسئلہ بھی کسی فرد کا نہیں ملت کا ہوتا ہے اور اہم ہوتا ہے چہ جائے کہ قائدین کو باعزت بری ان معاملات میں کیا جائے جو ملت کی تاریخ میں ایک اور داغ کا اضافہ کریں اور اہل حق کے مقابلہ یہود و نصاریٰ کے مفاد میں کام کریں:۔

''ہم رومیوں کی تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ وہ بہت سے دیوتاؤں پر اعتقاد رکھتے تھے، بحر و بر اور جنگ و امن ہر ایک کے لئے ان کا ایک الگ دیوتا تھا، لیکن ان دیوتاؤں کی پرستش کے باوجود کبھی کبھی ان پر بھی جھنجھلا جاتے تھے، اگر ان کو کسی مہم میں کامیابی نہ ہوتی یا ان کی امیدیں بر نہ آتیں تو دیوتاؤں پر بھی ان کا غصہ بھڑک اٹھتا تھا، تاریخ کا واقعہ ہے کہ رومی شہنشاہ آگسٹس (AUGUSTUS) کا بحری بیڑہ سمندر میں غرق ہو گیا تو وہ غصہ سے اتنا مشتعل ہوا کہ سمندر کے دیوتا نیپچون (NEPTUNE) کی مورتی چور چور کر دی، یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، ناکامی اور جھنجھلاہٹ انسان کی فطرت ہے، اور ہم تو مومن و موحد ہیں، اور ایک اللہ کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں، ہمارے لئے تو یہ کسی صورت میں جائز نہیں کہ کسی قیادت پر اللہ و رسول پر ایمان کی طرح کامل ایمان لے آئیں، ہمارا فرض ہے کہ اپنے قائدین کا محاسبہ کریں اور خود اپنے آپ کا محاسبہ کریں اور اپنے سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی حالات کا غائر نظر سے جائزہ لیں اور انھیں میں مصائب کے اسباب تلاش کریں، کسی فرد یا جماعت کی اندھی اطاعت و گمراہی کے ایسے غار میں پہونچا دے گی جہاں ہدایت کی روشنی نہیں پہونچ سکے گی، اور نہ اس سے نجات آسان ہوگی اور قیادت کا محاسبہ نہ کرنا اور اس کی غلطیوں کا مؤاخذہ نہ کرنا اور اس سے وضاحت نہ طلب کرنا، یہ ایسی اطاعت ہے، جس کے بارہ میں قرآن کا فیصلہ ہے۔

(.....بقیہ صفحہ نمبر ٦٤ پر.....)

نقد و نظر

مسجد اقصیٰ کے سلسلہ میں راشد شاز اور یہودی مستشرقین کی فکری ہم آہنگی

محمد غزالی ندوی

ہم نے جولائی/ اگست کے شمارے میں ذکر کیا تھا کہ شاز صاحب نے فلسطین میں مسجد اقصیٰ کے وجود کا بالکلیہ انکار کیا ہے، اس سلسلہ میں ان کے مغالطات کا ہم نے تعاقب بھی کیا تھا اور خود ان ہی کے اقوال سے ان کی فکر کا غلط ہونا واضح کیا تھا، اب اس شمارے میں یہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ مسجد اقصیٰ کے سلسلہ میں شاز صاحب کے تمام خیالات درحقیقت یہودی مستشرقین کے افکار وتلبیسات کا عکس ہیں ۔ جب سے اسرائیل عرب جنگ شروع ہوئی ہے اسرائیلی یونیورسٹیز میں مختلف افراد فلسطین اور شام کی ایک نئی تاریخ رقم کرنے میں مصروف ہیں ، ایک ایسی تاریخ جس میں فلسطین کے چپے چپے پر یہودیوں کا حق ثابت کیا جارہا ہے اور مسلمانوں کو غاصب باور کرایا جارہا ہے، ایک ایسی تاریخ جس میں یہ دکھایا جارہا ہے کہ مسلمانوں یا کسی دوسری قوم کا فلسطین سے کوئی دینی ومذہبی تعلق نہیں ہے، ایک ایسی تاریخ جس میں یہ ثابت کیا جارہا ہے کہ اسلام میں مسجد اقصیٰ کا کوئی مقام نہیں ہے، پھر بھی مسلمان خواہ مخواہ اس پر قبضہ کئے بیٹھے ہیں ۔تاریخ نویسی سے ہٹ کر تاریخ سازی کی اس مہم میں اعلیٰ درجہ کے یہودی دماغ شامل ہیں چند خاص نام یہ ہیں ''اسحق حسون''،''امنون کوہین''،''حافالزروس یافا''۔

تاریخ کو مسخ کرنے اور آنکھوں میں دھول جھونکنے کی اس کوشش میں روایتی یہودی ذہنیت نے ''یحرفون الکلم عن مواضعه'' اور ''فویل للذین یکتبون الکتاب بأیدیهم ثم یقولون هذا من عند الله لیشتروا به ثمناً قلیلاً'' کا مکمل نمونہ پیش کیا ہے۔اور دجل وتلبیس کے سارے گر استعمال کر کے اندھیرے کو اجالا اور اجالے کو اندھیرا ثابت کرنے کی مہم سر انجام دی ہے ۔افسوس کی بات ہے کہ شاز صاحب اور ان کے ہم نوا کچھ مستغربین انہی یہودیوں کے نظریات پر ایمان لے آئے ہیں اور پھر علم وتحقیق کی دنیا میں انھیں پیش کر کے تمام مسلمانوں سے اس بات کے طالب ہیں کہ ہر ایک ان یہودیوں کی بات پر آمنا وصدقنا اور سمعنا و أطعنا کہے ولکن هیهات هیهات!

مسجد اقصیٰ کے سلسلہ میں راشد شاز کے خیالات کا نقطہ ارتکاز ان کا یہ نظریہ ہے کہ مسلمانوں میں مسجد اقصیٰ کی عظمت یہودیوں سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، وہ لکھتے ہیں: ''جو لوگ یہودی تناظر میں مطالعۂ قرآن کے عادی تھے ان کے لئے اہل یہود کی سابقہ عظمت اور ان کے مذہبی اور دنیاوی جاہ وجلال کی علامتیں اب بھی بڑی اہمیت رکھتی تھیں ، ہمارے مفسرین نے اگر آیت اسراء کو واقعۂ ہجرت کے بیان کے بجائے معراج پر محمول کیا یا اگر مفروضہ آیت قبلہ میں بیت المقدس کی عظمت کے قائل ہوگئے تو اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ تفسیر قرآنی کے مروجہ ومقبول عام

طریقۂ کار میں یہودی مآخذ اور اضافی معلومات کو یک گونہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی''۔

(ادراک زوال امت ج ا ص ۱۵۰، اشاعت دوم 2005 نئی دہلی)

ایک دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں: ''اہل یہود کے مذہبی اور تہذیبی جاہ وحشمت کا تصور ہمارے مفسرین کے دل ودماغ پر کچھ اس طرح حاوی رہا ہے کہ ہم نے منہدم شدہ ہیکل سلیمانی کو عارضی قبلہ کی حیثیت سے قبول کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کیا''۔

ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: ''اضافی معلومات اور یہودی پس منظر کے زیر اثر ہم جس آیت کو تحویل قبلہ کی آیت قرار دیئے بیٹھے ہیں اگر صرف قرآنی پس منظر میں ان آیات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ہجرت کے بعد پیدا ہونے والے ذہنی اور نفسیاتی بحران کا بیان ملتا ہے اور بس''۔

(ادارک زوال امت، ج ا ص ۱۵۲، نئی دہلی 2005)

ان تمام تحریروں میں شاز صاحب نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مسجد اقصی کو مقدس سمجھنا ہو یا اسے قبلہ اولی ماننا، یہ سب یہودیوں سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھا، یعنی یہودی اسے مقدس سمجھتے تھے اسی وجہ سے مسلمانوں نے بھی اسے مقدس قرار دے دیا۔

شاز صاحب کے اس الزام کے ازالہ کے لے ہم صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ مسجد اقصی کو مسلمان کیوں کر یہودیوں سے متاثر ہوکر مقدس سمجھ سکتا ہے جب کہ وہ تو تب سے قائم، باعظمت ومرجع خلائق ہے جب روئے زمین پر کسی یہودی کا کوئی وجود نہ تھا، اس موضوع پر بہت تفصیل سے ہم جون کے شمارے میں دلائل دے چکے ہیں، یہاں مختصراً اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مسجد اقصی کی عظمت مسلمانوں کے دلوں میں یہودیوں سے متاثر ہوکر نہیں ہے، بلکہ مندرجہ ذیل اسباب کی بناء پر ہے۔

(۱) وہ قرآنی آیات جن میں مسجد اقصی کا صراحتاً یا ضمناً تذکرہ آیا ہے، مثلاً ﴿سبحان الذی أسری بعبدہ لیلا من المسجدا لحرام إلی المسجد الاقصی﴾۔ اس آیت میں مسجد اقصی کا تذکرہ آیا ہے اور اس سے مراد فلسطین ہی کی مسجد ہے، یہی جمہور امت کا مسلک رہا ہے اس کا انکار سوائے بعض شیعہ علماء، مستشرقین اور ان کے خوشہ چیں بعض مستغربین کے کسی نے نہیں کیا ہے، جن آیات میں ضمنا مسجد اقصی کا تذکرہ ہے ان میں سے ایک وہ آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا ﴿یا قوم ادخلوا الارض المقد س التی کتب اللہ لکم﴾۔ اے قوم، مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ، ظاہر ہے کہ وہاں کسی مقدس مقام کا ہونا ضروری تھا جس کی وجہ سے پوری سرزمین مقدس قرار پائے، اس سے پتہ چلا کہ وہاں حضرت موسی سے بھی پہلے کوئی مقدس مقام موجود تھا، وہ مقدس مقام کیا تھا؟ یہی مسجد اقصی جس کی تعمیر حدیث کے مطابق کعبہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد ہوگئی تھی۔

(۲) وہ بیشمار احادیث جن میں مسجد اقصی کی فضیلت کا بیان ہے اور جن کے راویوں کا دور دور تک یہودیت سے واسطہ نہیں رہا ہے، ایسی احادیث پر علماء کی مستقل تصنیفات بھی ہیں اور حدیث کی شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو جس میں مسجد اقصی کے فضائل بیان نہ ہوئے ہوں۔ اگر یہ تمام احادیث ناقابل اعتبار ہیں اور یہودی راویوں کی دین ہیں، یا ان سے متاثر ہوکر گھڑی گئی ہیں، تو ایک ایک روایت پر الگ الگ بحث ہونی چاہئے، ان میں سے کس کو کب کس نے گھڑا یہ دلائل کے ساتھ ثابت کرنا چاہئے، یہ علمی منہج ہے، اس کے برعکس مہمل اور گول مول بات کرنا کہ ''مسجد اقصیٰ'' کی عظمت یہودیوں سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، ایک کھوکھلی بے وزن اور بے دلیل بات ہے، نیز علمی منہج کے خلاف ہے، بلکہ تمام تاریخی روایات وجمہور امت کے اقوال اور احادیث وآیات قرآنیہ سے صرف نظر کرتے ہوئے ایسی بات کہنا خود یہودی پروپیگنڈے سے متاثر ہونے کی دلیل ہے۔

ذیل میں مسجد اقصی کے فضائل میں چند احادیث پیش کی جاتی

ہیں:

روئے زمین پر دوسری مسجد مسجد اقصی ہے امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح البخاری میں حضرت ابوذرؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے۔قلت یارسول اللہ أی مسجد وضع فی الأرض أول؟قال : المسجد الحرام قال:قلت :ثم أی؟ قال:المسجد الأقصی قلت: کم کان بینهما؟ قال: أربعون سنة،(صحیح البخاری حدیث نمبر ۳۳٦٦)۔

(۲) مسجد اقصی مسلمانوں کا قبلہ اولیٰ ہے:امام بخاری نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے:عن البراء بن عازب رضی اللہ عنه قال: کان رسول اللہ ﷺ یصلی نحو بیت المقدس ستة عشر أو سبعة عشر شهراً (کتاب الصلاة باب التوجه نحوالقبلة حیث کان حدیث 399)

(۳) مسجد اقصی سفر معراج میں آپ کی پہلی منزل تھی۔

امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے: عن أنس بن مالك أن رسول اللہ ﷺ قال: أتیت ا لبراق۔ وهو دابة أبیض طویل فوق الحمار ودون البغل۔ یضع حافره عند منتهی طرفه، قال فرکبته حتی أتیت بیت المقدس... قال ثم دخلت المسجد فصلیت فیه رکعتین۔

(۴)جب مسلمان مسجد اقصی کو دیکھنا دنیا وما فیها سے بہتر سمجھے گا۔

حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں نقل کیا ہے اور حافظ ذہبی اور شیخ البانی نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے، عن أبی ذر قال: تذاکرنا عند رسول اللہ ﷺ أیهما أفضل : أمسجد رسول اللہ أم بیت المقدس؟فقال رسول اللہ ﷺ :صلاة فی مسجدی أفضل من أربع صلوات فیه ، ولنعم المصلی هو ولیوشکن أن یکون للرجل مثل شطن فرسه من الأرض حیث یری منه بیت المقدس خیرله من الدنیا جمیعاً قال: أوقال : خیر من الدنیا وما فیها۔

(۵)مسجد اقصی میں دجال داخل نہ ہوگا۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: علامته یمکث فی الأرض أربعین صباحا ۔یبلغ سلطانه کل منهل لا یأتی أربعة مساجد الکعبة ومسجد رسول اللہ والمسجد الأقصی والطور۔

(٦)مسجد اقصی کی زیارت مشروع ہے:

امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے:

لا تشدالرحال الا إلیٰ ثلاثة مساجد المسجد الحرام ومسجدالرسول والمسجد الاقصی۔

اسی وجہ سے امام نووی لکھتے ہیں:فیه بیان عظیم فضیلةهذه المساجد االثلاثة ومیزتها علی غیرها، لکونها مساجد الانبیاء صوات اللہ وسلامه علیه ولفضل الصلاة فیها وفضیلة شدالرحال إلیها۔

حافظ ابن تیمیہؒ سے مسجد اقصی کی زیارت کے سلسلہ میں پوچھا گیا تو فرمایا:ثبت فی الصحیحین عن النبی ﷺ أنه قال : لا تشد الرحال .....وهو فی الصحیحین من حدیث أبی سعید وأبی هریرة وقدروی من طرق اخری ،وهو حدیث مستفیض متلقی بالقبول ، أجمع أهل العلم علی صحته وتلقیه بالقبول والتصدیق ، واتفق علماء المسلمین علی استحباب السفر الی بیت المقدس للعبادة المشروعة فیه،

وكان ابن عمر يأتي اليه فيصلي"

مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (۵/۶/۲۷) الطبعۃ الثانیۃ ۱۳۹۸ بحوالہ الشیعۃ والمسجد الاقصیٰ، ص ۵۶۔

۷۔ مسجد اقصیٰ میں نمازوں کا ثواب بڑھ جاتا ہے:

حضرت ابوذر کی حدیث ہے: تذاكرنا ونحن عند رسول الله ﷺ أيهما افضل :أمسجد رسول الله أم بيت المقدس ؟فقال رسول الله ﷺ :صلاة في مسجدي أفضل من أربع صلوات فيه ۔ مسجد نبوی ﷺ میں نماز کا ثواب مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے سے چار گنا زیادہ ہے، پھر بھی دوسری مساجد کے مقابلے میں مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ہوا۔

اختصار کی خاطر صرف سات حدیثیں پیش کرنے پر اکتفا کیا جارہا ہے ورنہ متقدمین اور متأخرین دونوں کی مستقل کتابیں اس موضوع پر ہیں، تیسری صدی ہجری ہی میں جو علوم اسلامیہ کی جمع وترتیب اور تدوین کا دور ہے مسجد اقصیٰ کے فضائل مرتب کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے، شیخ شہاب اللہ بہادر نے مسجد اقصیٰ کے فضائل پر لکھی جانے والی کتابوں کے تعارف پر ایک مستقل کتاب "معجم ماألف في فضائل وتاريخ المسجد الاقصى والقدس و فلسطين ومدنها" تصنیف کی ہے، کتاب میں انہوں نے اس موضوع پر ۲۲۰ کتابوں یا مخطوطات کا تذکرہ کیا ہے جن میں بعض طبع ہو چکے ہیں، بعض مفقود ہیں اور بیشتر آج بھی مخطوطات کی شکل میں ہیں۔

راشد شاز کا نظریہ اسرائیلی یہودی مستشرقین کے نظریات پر مبنی ہے :

سچی بات یہی ہے کہ شاز صاحب کے دوسرے بہت سے نظریات کی طرح ان کا یہ نظریہ بھی مستشرقین سے نہ صرف ماخوذ بلکہ ان کی مکمل ترجمانی ہے، شاز صاحب اور اسرائیلی مستشرقین کے درمیان اخذ واستفادہ کس حد تک موجود ہے اس کا اندازہ دونوں کی تحریروں کے موازنہ سے کیا جاسکتا ہے۔ موازنہ کے لیے ان کا ایک اقتباس ہم دوبارہ نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''جو لوگ یہودی تناظر میں مطالعۂ قرآن کے عادی تھے ان کے لئے اہل یہود کی سابقہ عظمت اور ان کے مذہبی اور دنیاوی جاہ وجلال کی علامتیں اب بھی بڑی اہمیت رکھتی تھیں، ہمارے مفسرین نے اگر آیت اسراء کو واقعۂ ہجرت کے بیان کے بجائے معراج پر محمول کیا یا اگر مفروضہ آیت قبلہ میں بیت المقدس کی عظمت کے قائل ہوگئے تو اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ تفسیر قرآنی کے مروجہ ومقبول عام طریقۂ کار میں یہودی مآخذ اور اضافی معلومات کو یک گونہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی''۔ (ادراک ج ا ص ۱۵۰، اشاعت دوم 2005 نئی دہلی)

شاز صاحب نے اس میں کہا ہے کہ بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) کی تقدیس یہودی مآخذ سے تاثر کا نتیجہ ہے۔ یہ وہی بات ہے جو متعصب یہودی مستشرق ''جوپتن'' نے اپنی کتابوں میں نیز ''لحافا لزروس یافا'' نے اپنی کتاب ''الاسلام خطوط عریضہ'' میں مسلمانوں کو مسجد اقصیٰ سے دور کرنے کے لیے لکھی ہے۔ لحافا لزروس یافا کی تحریر پڑھیے! وہ پہلے یہ سوال اٹھاتی ہیں کہ آخر کیوں کر ممکن ہوا کہ قدس جزیرۃ العرب سے دور ہونے کے باوجود مسلمانوں کے نزدیک قابل تقدس ٹھہرا؟

"كيف حدث أن القدس التى تبعد من شبه الجزيرة العربية أصبحت مقدسة أيضاً لدى المسلمين"؟

پھر اس کا جواب خود دیتی ہیں کہ دراصل قدس کی عظمت مسلمانوں کے دلوں میں یہودیت ونصرانیت سے متاثر ہونے کی وجہ سے ہے، اس لئے کہ اسلام کے بنیادی افکار بہرصورت یہودی ونصرانی مآخذ سے متاثر ہوئے ہیں، ''لحافا لزروس یافا''

لکھتی ہیں :"ليس من شك فى أن تقديس القدس فى الإسلام هو جزء من التأثير العام لليهودية والنصرانية على بدايات الإسلام،فالأفكار الأساسية للإسلام متأثرة بصورة أو بأخرى بالمصادر اليهودية والنصرانية"۔

(الاستشراق الاسرائیلی ، ص۲۲۵ ۔۲۲۶۔ بحوالہ الاسلام: خطوط عريضة، الفصل الحادى عشر۔)

مصنفہ نے اس سلسلہ میں دعوی کیا ہے کہ خدا کا عقیدہ، خدا اور انسان کے درمیان عہد کا عقیدہ، انسان کی اخلاقی ذمہ داری اور انبیاء کا عقیدہ، نیز فرائض یہ سب اسلام میں یہودیت ونصرانیت سے ماخوذ ہیں، اسی طرح اس سے کم تر درجہ کی بعض چیزیں بھی اسلام میں یہودیت ونصرانیت سے آئی ہیں، جیسا کہ قدس کی عظمت، بقول یافا: ففكرة الإله الأعلى خالق الكون والعهد المبرم بين الانسان وربه والمسؤلية الأخلاقية للإنسان تجاه أفعاله والانبياء الذين أرسلهم الله لكى يعيدوا البشر إلى الحق،الفرائض التى فرضها الله على الخلائق ۔كل هذه الأفكار وصلت إلى الإسلام من شقيقتيه الكبر يين اليهودية والنصرانية ، ومن خلال هذه المجموعة الغنية وصلت أيضا تفصيلات عديدة أقل أهمية ، أحدها كما يلاحظ هو تقديس القدس ۔

یہ عبارت الاستشراق الاسرائیلی کے مصنف نے حافالزروس یافا کی کتاب الاسلام : خطوط عريضة کے حوالے سے نقل کی ہے، (الاستشراق الاسرائیلی،ص۲۲۶)۔

مزید اسرائیلی مصنفہ نے لکھا ہے: لقد تقدست أرض اسرائيل بعامة ، والقدس على وجه الخصوص ، وأخذ ذلك كثيرا فى الفكر الإسلامى فى إطار انتشاره وتطوره ، سواء من الناحية الدينية أم الجغرافية، وكلما استوعب الإسلام بلدان العالم التى يفتحها كلما عمل على أسلمة القيم التى استوعبها، ومنها تقديس أرض إسرائيل، نباتها ومياهها والحياة فيها، وتبجيل الدفن بها وما شابه ذلك، كل ذلك قد تحول مند ذلك الوقت جزءًا من الإسلام الأورثوذكسى، وبخاصة بمساهمة المتصوفة والزهاد والنساك، الذين كانوا عرضةً لتأثير خاص من قبل الرهبان النصارى ، ولقد انعكس التقديس الإسلامى للقدس وأرض إسرائيل فى صورة بناء المساجد على جبل الهيكل" (الإستشراق الإسرائيلى ص۲۲۹۔)

اسی طرح کے خیالات کا اظہار دوسرے یہودی مستشرقین اسحٰق حسون، امنون کوہین، اور جویتن نے بھی اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

ایک دوسری جگہ اسرائیلی مستشرقہ حافا مزید لکھتی ہیں:

"يبدو أن توحيد المدينة على أيدينا فى حرب الأيام الستة، هو الذى زاد من تعظيم القدس فى العالم الإسلامى، ولكن لا مفر من الاعتراف بحقيقة تعظيم القدس فى الإسلام بسبب تقديسها عند اليهود والنصارى"۔

اسرائیلی یہودی مستشرقہ "حافالزروس یافا" کے ان مذکورہ اقتباسات اور شاز صاحب کی مذکورہ بالا تحریر میں جو یکسانیت ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسجد اقصی کے تعلق سے شاز صاحب کا نظریہ حیرت ناک حد تک غاصب اور قابض اسرائیلی یہودیوں کی تحریروں کا عکس ہے۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔

☆☆☆

ادبی تنقید (قسط-۲)

نغمہ و نور

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
گوشۂ مطالعات فارسی، علی گڑھ۔

(VI)

روحِ کون ومکاں آپؐ کی ذات ہے
باعث کن فکاں آپؐ کی ذات ہے(۷۰)

....

وہ ہے کون جس کے لئے بنے یہ زمین و چرخ، یہ مہر و مہہ
تھی ازل میں سب کو یہ جستجو، تھے سبھی اسی تگ و تاز میں (۷۱)

....

کرم اے باعث تخلیقِ کل محبوبِ سبحانی
ہجوم کفر و باطل میں پریشاں ساری امت ہے(۷۷)

....

یہ ذرے کیا یہ سبزہ کیا، مہہ و خورشید و انجم کیا
ہر اک شے دو جہاں کی میرے آقا کی بدولت ہے(۷۷)

....

حق تعالیٰ نے خاطر سے اک آپؐ کی کتنے عالم بنائے ہیں یا سیدی
آپؐ ہیں وجہ کن، نورِ ذاتِ خدا، آپؐ سے روشنی چاند تاروں میں ہے(۸۰)

....

وہ جو ختم المرسلیں ہے وجہ تخلیق جہاں
سب یہی نبیوں نے بتایا اس پیمبر کا پتا(۸۳)

....

آپؐ کے صدقے میں کیا کیا رب نے بخشا ہے ہمیں
یہ ہوا، یہ بہتے دریا، یہ شجر، یہ کھیتیاں(۸۵)

....

محبوب کبریا ہیں جو ہیں وجہ کائنات
بھیجو درود ان پہ، ملے گی رہِ نجات(۹۱)

....

سبب کون ومکاں ذات گرامی انؐ کی
قبل آمد بھی یہاں ہوتا تھا چرچا انؐ کا(۱۰۶)

....

آقا کی بدولت ہی بنائی گئی دنیا
آقا ہی نے ساغر اسے گلزار بنایا(۹۵)

....

انہیں کے نام سے چلتی ہے نبض کون ومکاں
کہ وہ ہمیشہ سے ذکر و خبر میں رہتے ہیں(۱۱۰)

....

وہ باعث ہیں دو عالم کا، رسالت ختم ہے انؐ پر
رہے ہر عہد کا عنواں صحیفوں کے حوالوں میں (۱۳۳)

....

انؐ کی خاطر دو جہاں رب نے کیے تخلیق
ساغر وہ گمراہ ہے جس کو نہیں یہ ہوش(۱۴۰)

....

نبی کریم ﷺ کو وجہ تخلیق جہاں، باعث ارض وسما، روح کون ومکاں، باعث کن فکاں، باعث تخلیق کل، وجہ کائنات، سبب کون ومکان ماننا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ دنیا اور دنیا کی ہر شے آپؐ کی بدولت اور آپؐ ہی کے صدقے میں اور آپؐ ہی کی خاطر وجود میں آئی ہے، اور نبض کون ومکاں آپؐ ہی کے نام سے چلتی

ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے، جس کا قرآن وحدیث کے ایمانداران مطالعے سے کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا۔ من گھڑنت فلسفوں سے ہمیں کوئی بحث نہیں ہے (ان شاء اللہ اس موضوع پر علیحدہ ایک تفصیلی مضمون حوالۂ قلم وقرطاس کیا جائے گا)

(V)

پیکر نور بنایا ہے خدا نے ان کو
ارض کونین میں پھیلے ہیں اجالے انؐ کے (۷۲)

.....

آپ محبوبِ حق اشرف الانبیاء
آپؐ کا نور آقا بہاروں میں ہے (۸۰)

.....

آپ ہیں وجہ کن، نورِ ذات خدا
آپ سے روشنی چاندتاروں میں ہے (۸۰)

.....

نور ہیں وہؐ تو بھلا کیسے ہو سایہ ان کا
شش جہت میں کوئی ثانی نہیں ملتا انؐ کا (۱۶۰)

.....

چشم باطل کو عبث رہتی ہے سایے کی تلاش
نور سے رب نے بنایا ہے سراپا ان کا (۱۰۶)

.....

قرآن وحدیث میں کہیں یہ مضمون نہیں پایا جاتا کہ کائنات کے ذرے ذرے میں آپؐ کا نور ہے۔ آپؐ کا سراپا نور سے بنایا جانا، آپ کا نور ہی نور ہونا، پیکر نور بنایا جانا..... یہ سب غیر اسلامی اور بے دلیل باتیں ہیں۔ ''پیکر'' مجسمے کو کہتے ہیں اور نور کا کوئی پیکر نہیں ہوتا۔ ''مجسمہ'' کسی ٹھوس مادے کا بنایا جاسکتا ہے، روشنی کا مجسمہ نہیں بن سکتا۔ قرآن پاک کی آیات: "قد جاء کم من اللہ نور وکتاب مبین" (المائدہ:۱۵) میں اگر لفظ نور سے آپؐ کی ذات مراد لی جائے تو اس کا مطلب بھی مفسرین قرآن کے نزدیک یہی ہے کہ آپؐ کے ذریعے سے اللہ کے بندوں کو ہدایت کی روشنی ملی۔ اکثر مفسرین نے اس کی یہی وضاحت کی ہے کہ اس آیت میں نور سے مراد ''دین اسلام، یا ہدایت کی روشنی ہے، اور رسول کریمؐ کو بھی مجازاً نور سے تعبیر کیا گیا ہے، ''نور مجسم'' یا ''پیکر نور'' کا مفہوم اس آیت سے نہیں نکلتا۔ ''نور'' کے ساتھ ''کتاب'' کا ذکر خود اس کا قرینہ ہے کہ یہاں نور اسلام یا نور ہدایت ہی مراد ہے۔ آپؐ نور کا پیکر یا نور کا مجسمہ نہیں تھے، نور کی صفت سے متصف تھے، آپؐ کے ذریعے دنیا میں ہدایت کی روشنی پھیلی۔ حضورؐ کا جسم ''ٹرانسپیرنٹ'' نہیں تھا، یہ قطعاً غیر اسلامی عقیدہ ہے۔ آپؐ بھی دیگر انسانوں کی طرح ''گوشت، پوست کا مجموعہ'' تھے۔ اگر پیکر نور مانا جائے گا تو انسانیت کا انکار لازم آئے گا، اور انسانیت کے انکار سے قرآن کا انکار لازم آئے گا کیوں کہ قرآن نے تمام انبیاء کو انسان (بشر) ہی بتایا ہے اور آیات قرآنیہ سے نبیؐ کا انسان (بشر) ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔ پیکر نور ماننا- بشریت کا انکار ہے، اور انبیاءؑ یا کسی بھی نبی کی بشریت کا انکار، قرآن کا انکار ہے، اور قرآن کے ایک حرف کا بھی انکار کرنا کفر ہے..... پھر حضورؐ کو ''نور ذات خدا'' کہنا تو کھلا ہوا شرک ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی ''مخلوق'' ہو ''خالق'' کی ذات کا حصہ یا ٹکڑا ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا۔

(VI)

دارفنا میں چارۂ بیچارگاں ہیں آپؐ
فضل وکرم پہ آپؐ کے تکیہ عدم میں ہے (۶۱)

.....

اے مہر صلح وآشتی حسنِ یقیں کی خیر
امت تمام پنجۂ جور وستم میں ہے (۶۱)

.....

ساغر امیدوار ہے کب سے مرے حضورؐ
کیا دیر جنبش نگہہ محترم میں ہے(۶۱)

.....

کب آئے گا پیام حضوری مرے لیے
رہتا ہوں صبح وشام اسی اضطراب میں (۶۳)

.....

نور ایماں کا فقدان ہے چار سو، گمرہی رہبر زندگی ہوگئی
اب نگاہ توجہ میں کیا دیر ہے، انتہا ظلمت کفر کی ہوگئی(۶۳)

.....

اور بھی حاجت الطاف وکرم ہے اس وقت
بدلا بدلا ہے مسلمان رسولِ عربیؐ(۶۶)

.....

جس نے بھی آپؐ کی رحمت کا سہارا چاہا
اس کی مشکل ہوئی آسان رسول عربیؐ(۶۶)

.....

بے نیاز غم حالات ہے وہ خوش قسمت
آپ ہیں جس کے نگہبان رسول عربیؐ(۶۷)

.....

پھر ذرا چشم عنایت کا اشارہ کیجئے
کفر کی زد میں ہے ایمان رسول عربی(۶۷)

.....

ہو ساغر تشنہ پہ بھی کچھ لطف وعنایت
اے ابر کرم، سایہ داماں محمدؐ(۶۹)

.....

آپؐ کی ذات اقدس سراپا کرم، آپؐ کے امتی ہیں گرفتار غم
کیجئے کچھ کرم یا شہہ ذوالکرم، رحمت بے کراں آپؐ کی ذات ہے۔(۷۰)

.....

نت نئے قوم مسلم میں فرقے بنے، غیر قوموں کے ہنسنے کے ساماں ہوئے
راہ حق پھر جہاں کو دکھا دیجیے، ہادی گمرہاں آپؐ کی ذات ہے(۷۰)

.....

عرش والے بھی نازاں ہیں مسرور ہیں فرش والے بھی نسبت پہ مغرور ہیں
زینت دوجہاں آپؐ کا نور ہے، نازش دوجہاں آپؐ کی ذات ہے۔(۷۰)

.....

وہ جو سیلاب میں گھر سے بے گھر ہوئے، اور فسادات میں جو گداگر ہوئے
ان غریبوں کی امداد فرمایئے، حامی بیکساں آپؐ کی ذات ہے۔(۷۰)

.....

زینت بزم امکاں خیال آپؐ کا، رونق ہر جہاں ہے جمال آپؐ کا
قلب ساغر بھی کردیں منور شہا، نور بخش جہاں آپؐ کی ذات ہے۔(۷۰)

.....

آپؐ کی رحمتوں کے بھروسے پہ ہم، جی رہے ہیں ابھی تک شہہ محترم
ہے یقیں جب بھی ہوگی نگاہ کرم، دن پریشانیوں کے گزر جائیں گے۔(۷۳)

.....

آندھیاں غم کی ہوں یا کہ ہوں حادثے، آپؐ کی چشم رحمت رہے ہر گھڑی
آپؐ کے دامن عاطفت کی قسم، طے ہر اک راہ دشوار کر جائیں گے(۷۴)

.....

وہؐ ہیں رحمتوں کے پیکر وہؐ ہیں صاحب کرم بھی
سبھی کچھ ملے گا ان سے، کوئی مانگے عاجزانہ(۷۴)

.....

یا حبیب خدا، یا شہہ دوسرا، بعد رب آپؐ کا ہے بس آسرا
اب تو امداد ہو میری بہر خدا، کشتی زیست طوفاں کے دھاروں میں ہے۔(۸۰)

.....

آپؐ شمع ہدایت ہیں یا مصطفیٰ، آپؐ دریائے رحمت ہیں یا مصطفیٰ
ہو گنہگار ساغر پہ چشم کرم، یہ بھی تو آپؐ کے جاں نثاروں میں ہے(۸۰)

.....

یہ لطف مجھ پہ اے مرے سرکار ہو کبھی
روئے جمیل کا مجھے دیدار ہو کبھی (۷۷)

.....

کچھ شاہ و گدا کی اس در پر تخصیص نہیں، تفریق نہیں
سب اپنی مرادیں پائے ہیں سرکار دوعالمؐ کے در سے (۱۱۴)

.....

ہو چشم کرم ان کی تو چھٹ جائیں گے بے شک
بادل جو شب ہجر کے یہ چھائے ہوئے ہیں (۱۲۲)

.....

عرش بریں پر آنا جانا انؐ کے لیے کب مشکل ہے
مشکل کو آسان بنانا انؐ کے لیے کب مشکل ہے (۱۲۴)

.....

میں کیوں طوفان سے گھبراؤں میں وابستہ ہوں ان سے
میری کشتی پار لگانا ان کے لیے کب مشکل ہے (۱۲۴)

.....

ان کی رحمت سے ناامید نہ ہو، چھٹ ہی جائیں گے رنج کے بادل
قلب مضطر سکون پائے گا، سید الانبیاء کی بات کرو (۱۲۷)

.....

سلیقہ تھا کہاں مجھ کو کہ نعت شاہ دیں لکھتا
یہ ان کا لطف ہے جو نعت کے مضمون آئے ہیں (۱۳۴)

.....

سب اپنی فکر شاہ مدینہ پہ چھوڑ کر
بہتر یہی ہے خلد کے زینے کی بات ہو (۱۳۶)

.....

مسطورہ بالا تمام اشعار میں جس طرح آپؐ کو مخاطب کیا گیا ہے، جو صفات آپؐ سے منسوب کی گئی ہیں، جن توقعات اور مرادوں کے پورا کرنے کی قدرت آپؐ سے وابستہ کی گئی ہے، وہ سب بے دلیل اور عقیدہ توحید خالص کے خلاف باتیں ہیں۔ دار فنا اور عدم میں کیا فرق ہے اس کی وضاحت کی ذمہ داری شاعر پر ہے۔ امت کو پنجہ جور وستم سے بچانا، شاعر پر نگاہ کرم کرنا، پیغام حضوری بھیجنا، ظلمت کفر کی انتہا کو مٹانا، بدلے بدلے مسلمان پر نگاہ لطف وکرم کرنا، آپؐ کی رحمت کا سہارا چاہ کر مشکل حل کرنا یا ہوجانا، بغیر ثبوت کے آپؐ کو اپنا نگہبان سمجھ کر غم حالات سے بے نیاز ہوجانا (بے نیاز غم حالات ہونا بھی اس کتاب کی نادر تراکیب میں سے ہے)، چشم عنایت کا اشارہ کر کے کفر کی زد سے بچانا، حیات ظاہری کے بعد اور حشر سے پہلے کسی تشنہ پر لطف وعنایت کرنا یا کرم کرنا، قرآن وحدیث کا آئینہ موجود ہوتے ہوئے پھر سے جہاں کو راہِ ہدایت دکھانا، مسلمانوں کی فرقہ بندی کو ختم کرنا، فرشتے جو انسانی احساس و جذبات سے معریٰ ہیں ان کے مسرور یا مغموم ہونے کا ذکر کرنا، حضورؐ کا فساد اور سیلاب سے بے گھر ہونے اور بھکاری بن جانے والوں کی امداد کرنا، کسی کے دل کو منور کرنا، کشتی زیست کو طوفان کے دھاروں سے بچانا، حشر سے پہلے گناہگاروں پر چشم کرم کرنا، کسی کو اپنا دیدار کرادینا، گناہگاروں کی پریشانیوں کے دن گزروادینا، ہر دشوار راہ طے کرادینا، مانگنے والے کو سب کچھ عطا کردینا، آپؐ کے در سے شاہ وگدا سب کی مرادیں پوری ہونا، چشم کرم سے ہجر کے بادل چھٹ جانا، عرش پر آنا جانا مشکل نہ ہونا، ہر مشکل کو آسان کردینا، کنکر سے کلمہ پڑھوانا، طوفان سے کشتی پار لگانا، ان کی رحمت سے ناامید نہ ہو کر غم کے بادلوں سے بچ جانا، نعت کے مضامین کا شاعر پر القا کرنا، ساری فکریں شاہِ مدینہ پر چھوڑ دینا..... ان میں سے ایک بات بھی قرآن وحدیث سے ثابت شدہ اسلامی عقائد ونظریات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ تمام امور صرف خدائے قادر وقیوم کے قبضہ و قدرت میں ہیں، رسول کریمؐ کا ان سے کوئی تعلق نہیں، نہ آپؐ کو ان کا اختیار حاصل ہے۔ آپؐ جو کچھ مدد اور کرم کرسکتے تھے، جو ہدایت ورہنمائی کرسکتے تھے وہ آپؐ کی حیات ظاہری تک محدود تھی، یا پھر قیامت میں گناہگار مسلمانوں کی شفاعت (اور وہ بھی پہلے خدا سے اجازت لے کر) فرمائیں گے۔ رسولؐ سے دعا یا التجا کرنا بھی شرک جلی کے دائرے میں آتا ہے..... اب ہدایت کے لیے قرآن پاک، احادیث مبارکہ اور آپؐ کی سیرت طیبہ کا روڈ میپ موجود ہے جو قیامت تک..... پورے عالم کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن پاک کی سورۃ المائدہ کی آیت:۳ کا یہ حصہ "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" اس پر آخری مہر لگا چکا ہے۔

☆☆☆

(.....**جاری**)

تعارف و تبصرہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نام کتاب: فکر اسلامی کا ارتقاء (ہندوستان کا خصوصی مطالعہ)

صفحات: ۲۳۰

قیمت: درج نہیں

ناشر: آئی، او، ایس، نئی دہلی۔

ملنے کا پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی۔

زیر نظر کتاب فکر اسلامی کے اس تسلسل وارتقاء کا حصہ ہے جس پر کبھی جمود کا سایہ تک نہ پڑ سکا، الزام تراشیاں کرنے والوں کا وظیفۂ زندگی ہے کہ وہ نت نئے الزام تراش کر امت مسلمہ کو تشکیل وتجدید کی فکر سے غافل کر کے انتشار میں مبتلا کریں، لیکن فکر وذہن سے معذوران بے چاروں کو معلوم نہیں کہ جس دین کی بابت آخری کتاب میں یہ آفاقی حقیقت درج کردی گئی کہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا، جس حقیقت کا ادراک خود اہل کتاب بلکہ دشمنان اسلام کو بھی تھا اور ہے، تو اس کے بعد فکر اسلامی کی تجدید کا کام کیوں کر رک سکتا ہے، تشکیکی مزاج کی تشکیل کرنے والوں کی کوکھ سے مجددین نے جنم لیا، مسلمہ عقائد پر تیشہ چلانے والوں کی مذموم کوششوں کے نتیجہ میں متکلمین اسلام کا گروہ ظہور پذیر ہوا، مزاج شریعت کی من مانی تشریح شروع ہوئی تو محدثین وفقہاء مدمقابل بن گئے، خرافات وبدعات کا دور دورہ ہوا تو مصلحین سینہ سپر ہوگئے، انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون کا وعدہ جو فرمایا گیا ہے اس میں بڑی وسعت وکاملیت ہے، وہ وعدہ صرف قرآن مجید کی حفاظت کا نہیں بلکہ اس کے الفاظ ومعانی اور اس کے احکامات ومتعلقات وتشریحات کی حفاظت کے وعدہ پر مشتمل ہے، یہی وجہ ہے کہ عروج وزوال کی داستانیں رقم ہوتی رہیں لیکن فکر اسلامی کا ارتقائی عمل جاری رہا، جو لوگ عہد جدید میں جمود وتعطل کے شاکی ہیں ان کی شکایت میں ان کی کج فہمی یا بے اعتمادی کو بڑا دخل ہے، ورنہ فکر اسلامی کے حاملین آج بھی ہر محاذ پر اپنی کاوشوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں، یہی نہیں بلکہ قوت ایمانی سے سرشار افراد ہر محاذ پر مزاحمت کر رہے ہیں اور استعماری قوتوں کی راہ میں روڑا بنے ہوئے ہیں، جس کے نتیجے میں دنیا کو کشت وخون تو نظر آتا ہے لیکن اکثریت واقعات کی حقیقت اور اسباب وعلل سے نا آشنا نظر آتی ہے، اکثریت کی بساط فکر کی وسعتیں ایجنسیز کے تجزیات یا مریض فکر کے حامل مغرب زدوں کی تحلیلات پر ختم ہوجاتی ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی صاحب معتدل اور مثبت فکر کے حامل ہیں، ان کی تنقیدوں میں علمیت اور ایجابیت کا رنگ ہوتا ہے، علمی حدود اور جادۂ اعتدال سے وہ تجاوز نہیں کرتے، اصحاب قلم کی یہی خصوصیت انہیں اہل علم کی صف میں شامل کرتی ہے، ان کے مزاج وتحریر میں صالحیت ونافعیت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے، صالحیت سے اگر دین ودنیا کی تعمیر ہوتی ہے تو نافعیت زندگی ودوام کی ضامن ہے، ان کی اس نئی علمی کاوش میں بھی یہ خصوصیات نمایاں طور پر موجود ہیں، جس کو آں محترم نے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور اس کو مستقل تصنیف کہنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں، اگرچہ راقم سطور کو یہ کتاب مجموعۂ مقالات معلوم ہوتی ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کو مستقل تصنیف کی حیثیت سے پیش کرنے پر محنت کی گئی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔

بہر حال یہ کتاب پیش لفظ، تقریظ، سپاس گزاری، مقدمہ چار ابواب، خلاصۂ بحث، فکر اسلامی پر تحقیقات کے مختصر

اور شاریے نیز ماخذ ومصادر کی فہرست اور شخصیات کے اشاریہ پر مشتمل ہے۔

کتاب کی ابتداء ڈاکٹر محمد منظور عالم کے پیش لفظ سے ہوتی ہے، پھر ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی کی تقریظ زینت قرطاس ہے، یہ تقریظ اس سوال پر تمام ہوتی ہے کہ ''اگر امت مسلمہ میں بحیثیت مجموعی اجتہاد کبھی رکا نہیں اور اگر اجتہاد بقول مصنف ہمیشہ معاشرتی ہوتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ امت مسلمہ متواتر زوال کی جانب جارہی ہے'' اس کتاب میں اس سوال کا جواب بجا طور پر موجود ہے، راقم کے نزدیک اس سوال کا جواب بہت مختصر ہے اور وہ ہے رجوع إلى الاسلام من جديد، بقول علامہ شبلی نعمانی مسلمانوں کی ترقی کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ اپنے ماضی کی طرف پلٹیں اور اس طرح پلٹیں کہ قرون اولیٰ سے جا ملیں ___ ہمارے سلسلۂ زوال کے انقطاع کا یہی واحد نسخہ ہے جس کو صحیح معنی میں نہ روایت پسند قبول کرنے کو تیار ہیں کہ ان کے فکر کا مرجع صدی دوصدی تک محدود ہے اور تجدد کے ماروں کے لیے تو یہ زہر کا گھونٹ ہے، وہ پییں تو کیسے اور کیوں کر پییں ___ اس سوال کے جواب میں ہزاروں صفحات سیاہ کر دیے گئے، حق پرست اہل علم نے صحیح معنی میں اسباب زوال امت کو بیان کر دیا، تجدد کے علمبرداروں نے ادارک زوال امت کی کوشش میں ہزاروں نئے سوال کھڑے کر دیے بلکہ بسا اوقات روح اسلام پر تیشہ زنی ان کے ادراک کی انتہا ٹھہری، قلعہ اسلام میں شگاف ڈالنا ان کا مقصد نظر آیا، جو قومیں زوال کے شکنجہ میں ہوتی ہیں وہ ذہنی الجھنوں اور نظریاتی بحثوں سے باہر نہیں نکل پاتیں ___ مسلمانوں کے دور عروج کے مطالعہ سے رہنمائی ملتی ہے کہ نظریاتی بحثیں ان ادوار میں کم تھیں، تحریک عمل تیز گام تھی، یا یوں کہہ لیجئے کہ نظریہ اور اس کی عملی تطبیق کا عمل اس طرح جاری تھا کہ ذہنی الجھنوں اور محض بحثوں کی کوئی جگہ نہ تھی، عہد جدید کا مطالعہ پتہ دیتا ہے کہ فکر اسلامی کے باب میں اقدام وعمل پر نظریاتی بحثوں کا پلڑا بھاری ہے، اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عہد جدید کی دانشوری فکر اسلامی کو موضوع بناتے ہوئے تجدد وتجدید کے نمایاں مگر لطیف فرق کو ملحوظ نہیں رکھتی، تجدید کی بات ہوتے ہوئے تجدد کی لہریں اٹھتی ہیں اور معاشرے کے سکون کو غارت کر دیتی ہیں۔

مصنف محترم نے فکر اسلامی کے تعارف میں جو اقتباسات نقل کیے ہیں وہ یقیناً بصیرت افروز اور ان کی فکری پختگی کے ساتھ ان کے تجدد پسندی کے مقابلہ تجدیدی فکر کا حامل ہونے کا ثبوت دیتے ہیں، ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مزاج یا اسلامی ذہنیت، ''فکر اسلامی'' کا دوسرا نام ہے اور ظاہر ہے کہ اسلامی مزاج پر شمع نبوت کی کرنوں کا عکس ہوگا، اس صورت میں تجدد پسندی کو کوئی جگہ نہ مل سکے گی ___ اسباب زوال کے ادراک میں تشنگی کے احساس یا متواتر زوال کا سلسلہ ختم نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم اجتہاد کے نام پر مذہب کو اپنے ذہن ومزاج کے مطابق کسی نہ کسی درجہ میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں، خواہ لاشعور میں ہی کیوں نہ ہو مگر اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ عہد جدید میں جمال الدین افغانی، محمد عبدہ اور ہندوستان میں سرسید احمد خاں کے تمام تر تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کے ان کے تفردات نے نہ ختم ہونے والی بحثوں کا ایسا لا متناہی سلسلہ شروع کر دیا جس کے سبب امت دو طبقات میں تقسیم ہو کر رہ گئی، وہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور اس کے توقف کی بس یہی شکل ہے کہ ایک بار پھر فکر اسلامی کی شمع کو اس کے حاملین اولین کے طرز فکر سے جلا بخشی جائے، اس کتاب میں فاضل مصنف نے جا بجا تجدد پسندی پر صریح نقد کیا ہے اور سوائے چند مقامات کے اکثر تجدید کو ہی فکر اسلامی کا عنصر قرار دیا ہے، وہ تجدد وتجدید کا فرق برتنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔

اس تقریظ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے سپاس گزاری اور پھر اپنا عالمانہ مقدمہ لکھا ہے، مقدمہ میں انہوں نے اختصار

وضاحت کے ساتھ فکر اسلامی کی تاریخ پر کلام کیا ہے اور بجا تحریر کیا ہے کہ فکر اسلامی کی اصطلاح خاص انیسویں صدی میں خدا بے زار مغربی افکار کے ردعمل کے طور پر وضع کی گئی، انہوں نے فکر اسلامی اور علم کلام کے عنوان سے بھی جامع بحث کی ہے، اس ضمن میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید پر بھی کلام کیا ہے، یہاں پہنچ کر ان سے اختلاف کی گنجائش پیدا ہوجاتی ہے، (لیکن ظاہر ہے تبصرہ تفصیل کا حامل نہیں ہوسکتا) وہ لکھتے ہیں ''تشکیل جدید کی کاوشوں کو ہر زمانے میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے'' راقم کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ تجدید کے علمبرداروں کو ہمیشہ ان کی تجدیدی کوششوں کا نتیجہ مثبت ملا ہے، لیکن یہ تب ہی ممکن ہوا ہے جب ان کاوشوں پر سیرت کا پرتو، قرآن وسنت کا عکس اور صلحاء امت کے اجتہادات کی روشنی غالب رہی ہے، محض تفردات اور ایسے تفردات جو تجدد پسندی کا مظہر ہونے کے ساتھ قرآن وسنت سے متصادم ہوئے، خواہ وہ کسی کے ہوں کسی زمانہ میں پنپ نہ سکے، وجہ اس کی کتاب الٰہی میں انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون کے ذریعے بیان کردی گئی، اس ضمن میں انہوں نے مولانا مجیب اللہ ندوی کا جو اقتباس نقل کیا ہے اس نے حیرت میں ڈال دیا، مولانا مرحوم کی جلالت علمی کے ساتھ ان سے اس بات کی نسبت بڑی عجیب لگی ''.....ان حضرات (مفتی محمد عبدہ، سر سید، محمد اقبال) کی کوششیں یا تو علماء کی قدامت پرست ذہنیت کی وجہ سے بارآور نہ ہوسکیں یا لوگ ان کو سمجھ نہ سکے.....'' لیکن یہ حیرت واستعجاب زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا، راقم نے جب مولانا کے مقالہ سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ جو اقتباس ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی طرف منسوب کیا ہے مولانا نے اس میں اپنی فکر نقل نہیں کی ہے بلکہ تنقید کی غرض سے اس سیمینار کے ذمہ داروں کی فکر کو نقل کیا ہے جس میں انہیں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، پھر اپنے پورے مقالے میں اسی فکر پر تنقید کی ہے، ایسی صورت میں اس اقتباس اور ایسی فکر کو مولانا مجیب اللہ صاحب کی طرف کیوں کر منسوب کیا جاسکتا ہے، اگر یہ مصنف کا سہو ہے تو اور بات ورنہ اقتباس کو اپنے سیاق وسباق سے کاٹ کر اپنی تائید میں نقل کرنے کا رویہ درست نہیں، اگر کتاب میں ایک جگہ ایسا ہوا ہے تو دیگر مقامات پر بھی رجوع کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اقتباس کی نسبت سے قطع نظر بھی یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ بات کیوں نقل کی کہ مفتی محمد عبدہ سر سید محمد اقبال کی کوششیں ''یا تو علما کی قدامت پرست ذہنیت کی وجہ سے بارآور نہ آسکیں یا لوگ ان کو سمجھ نہ سکے''، تاریخ اصلاح و تجدید میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب ''سمجھ'' کا ایسا کال پڑ جائے، ہاں تصلب فی الدین یا عقائد کے باب میں شدت پسندی شیوۂ سلف تھا اور یہی شیوہ مقبول ومحبوب ہے، عقائد کے باب میں اجتہاد کی گنجائش نہیں، احکامات میں اجتہاد اور اس اجتہاد میں تغیرات زمانہ کا وسیع تر لحاظ ہی ہے جو آج دین اسلام اس دور زوال میں بھی ہمارے سامنے سرسبز وشاداب ہے۔ اور پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ اقبال مرحوم کو جو مقام تجدید عطا ہوا، اس پر انہیں روایت پرست علماء نے ہی فائز کیا، اگر وہ انہیں نہ سمجھتے تو انہیں محرم راز کیوں قرار دیتے، لیکن ظاہر ہے کہ علماء کا کام ہی تنقیح ہے، اور تنقیحی عمل ہر رطب ویابس کو قبول کرنے سے مانع ہے، اس ضمن میں علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریریں اور نقوش اقبال کے مقدمہ کا مطالعہ افادیت سے خالی نہ ہوگا۔

مقدمہ میں آگے موضوع کتاب کے دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں یہ لکھا گیا ہے کہ یہ موضوع نیا اور اچھوتا ہے، اس کی جگہ اگر یہ لکھا جاتا کہ اس نام سے کتاب نئی ہے تو زیادہ موزوں تھا، مواد تو اس موضوع پر خوب میسر ہے، البتہ اس نام سے موسوم نہ ہونا الگ بات ہے، تاریخ اصلاح وتجدید اور مفکرین امت سے متعلق بے شمار تحریریں ہیں جن میں سے خود لائق مصنف نے بہت سی کتابوں کا اشاریہ دیا ہے، تاہم اس کتاب کی یہ خصوصیت

ہے کہ اس میں تنقیدی محاکمہ کو جگہ دی گئی ہے، اور بیشتر نقد ایجابی و علمی ہے، البتہ اس سے انکار نہیں کہ کہیں انداز تجزیاتی ہے اور کہیں دفاعی لیکن اچھوتے پن اور افادے سے خالی نہیں۔

باب اول میں فکر اسلامی کا تعارف پیش کیا گیا ہے، قرآن و سنت میں فکر اسلامی کی اساسیات پر مدلل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، فکر اسلامی کے عناصر سے بحث بھی اس باب کی زینت ہے، عناصر کی تعیین میں مصنف کی فکری بصیرت ابھر کر سامنے آئی ہے، اور پھر ان عناصر پر گفتگو انتہائی علمی اور بصیرت افروز انداز میں کی گئی ہے، انہوں نے سات عناصر شمار کیے ہیں، مقصدیت کی تلاش ، جامعیت کا فروغ، اسلامی تہذیب کی حمایت و محافظت، اجتہادی بصیرت، معروضیت وعلمیت، نافعیت اور عصری حسیت وغیرہ، مصنف کی نظر میں وہ بنیادی عناصر ہیں جن سے فکر اسلامی کی آبیاری ہوتی ہیں، کیا خوب ہوتا کہ فکر اسلامی کے عناصر میں آں محترم ''دعوتی مزاج'' کو بھی جگہ دیتے، اور اس کی علمی تشریح کرتے، فکر اسلامی کے بانی حضرت محمد ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی دعوت تھا، آپ کے تشکیل کردہ معاشرہ میں دعوتی مزاج کو نمایاں اہمیت حاصل ہے، فکر اسلامی کے ارتقائی سفر میں اگر کہیں تعطل کا شائبہ ہوتا ہے تو اس کا سبب اس دور کے علماء اور اہل علم میں دعوتی مزاج کا فقدان ہی نظر آتا ہے، بہر حال الفاظ کا قالب تبدیل ہوسکتا ہے مگر واقعی یہی وہ عناصر ہیں جن سے فکر اسلامی کا غلبہ وارتقاء ممکن ہے، اس میں بھی جامعیت کے فروغ سے صورت حال پر قابو پانا، جزوی اختلافات سے صرف نظر کرنا اور اسلام کی آفاقیت کو بحال کرنا نیز نسل نو کا اسلام پر اعتماد بحال کرنا ممکن ہے، جامعیت سیرت رسول اور اسوۂ حسنہ کا امتیازی وصف ہے، صحابہ کرام کی زندگیاں اسی صفت کے باعث قابل رشک نظر آتی ہیں، یہاں یہ بات نوک قلم پر آہی گئی کہ کتاب کی زبان علمی اور جا بجا ادبی ہونے کے ساتھ کہیں کہیں ثقیل بھی ہے، بسا اوقات اردو کو بوجھل کرنے والی غیر صحیح یا غیر فصیح لفظیات بھی مستعمل ہیں، اجتہادی بصیرت کے ساتھ اردو میں دانشورانہ اپراچ کے استعمال کی ہر دلیل بے جا ہی سمجھی جائے گی، اسی طرح ایک عالم کے نام کے ساتھ جب مولانا لکھ دیا تو اب ماسٹر بھی لکھنا نامناسب ہی تصور کیا جائے گا۔

دوسرے باب میں فکر اسلامی کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس کے اولین معماروں میں فقہاء و اصولیین، اسلامی عمرانیات کے مسلم مفکرین، یونانی فکر کے اسلامی ناقدین پر گفتگو کی گئی ہے، اسی باب کی تیسری فصل میں تجدید واحیاء دین میں فکر اسلامی کے کردار اور اس کے عناصر کے ذریعہ کار تجدید کی انجام دہی پر بحث کرتے ہوئے تاریخی شہادتیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

تیسرے باب میں ہندوستان میں فکر اسلامی کے ارتقائی سفر کا مطالعہ کیا گیا ہے، اہم اسلامی مفکرین اور ان کے افکار وآراء کا ناقدانہ تجزیہ کیا گیا ہے، اس باب میں ایک شائع شدہ مقالہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے متعلق بھی شامل ہے، جو ہماری تعلیقات کے ساتھ ہمارے مرتب کردہ مجموعہ مقالات (Proceeding) کی زینت ہے، اس کے بعض اجزاء ایک اور جگہ پر بھی نظر سے گذرے ہیں۔

باب چہارم میں ہندوستانی مسلم اقلیت کے عروج واستحکام میں فکر اسلامی کے کردار سے بحث کی گئی ہے، فکر اسلامی کی راہ میں مزاحم قوتوں اور رکاوٹوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور آخر میں مسلم مفکرین کی فکری تحریروں کا معروضی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، راقم کو اس سے سخت اختلاف ہے کہ جا بجا ہندستانی مسلمانوں کے اتھ اقلیت کی اصطلاح مستعمل ہو، کیوں کہ اس کے استعمال سے گویا ہم برہمنوں کی اس چال کے مؤید نظر آتے ہیں جو انہوں نے ۱۹۵۶ میں چلی، اس سے قبل والی مردم شماری تک شودر یا دلت قبائل ایک الگ شناخت رکھتے تھے، اور ان کی تعداد بھی زیادہ تھی، لیکن انگریز و مسلم قوتوں کے اثرات زائل

ہوتے ہی ۱۹۵۶ میں برہمنوں نے کمال عیاری سے تمام پس ماندہ اقوام کو روایتی ہندوں کی صف میں شامل کرلیا، صحیح بات یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمان اگر واقعی دعوتی کردار ادا کرتے تو اس کے امکان روشن تھے اور ہیں کہ اس ملک کی اکثر آبادی کو جو اپنے کو ہندو نہیں کہتی (یہ الگ بات کہ اب لاعلمی میں سمجھنے لگی ہے) اسلام کی آغوش میں بٹھادیا جاتا، خیر یہ الگ بحث ہے جو برسرتذکرہ آگئی، موجودہ صورت حال کے مدنظر اس باب میں مصنف نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اپنا مطالعہ پیش کیا ہے، لیکن بسا اوقات قاری تفصیل کا طالب ہوتا ہے مگر اسے تشنگی کا احساس رہ جاتا ہے، کاش آئندہ ایڈیشن میں وہ اس پہلو پر غور کرلیں، راقم کا احساس ہے کہ ہندوستان میں فکر اسلامی کے ارتقاء وحفاظت کے ضمن میں دعوتی کوششوں پر تفصیلی بحث ہوتی اور ان کا ناقدانہ جائزہ لیا جاتا، مدارس اسلامیہ کے کردار پر مثبت روشنی ڈالی جاتی اور ان کا احتساب کیا جاتا، اس لئے کہ ہندستان بلکہ برصغیر میں فکر اسلامی کی حمایت وحفاظت اور اس کے ارتقاء میں مدارس کا کردار مسلم ہے، بحث وتحقیق کے مخصوص علمی مراکز بھی موضوع بحث بنتے، مزاحمتی قوتوں سے بحث کرتے ہوئے اس پہلو سے بھی غور کیا جاتا کہ اس ملک میں مسلمانوں کے زوال کی ایک وجہ دانشوروں کی مختلف فیہ دانشوری ہے، ان کی جانب سے فکر اسلامی پر بحث کرتے ہوئے ان لادینی عناصر کا داخل کردینا بھی ایک سبب ہے جن کا فکر اسلامی کی روح وتاریخ سے کوئی حصہ نہیں، راقم سطور کا یہ بھی خیال ہے کہ مزاحمتی طاقتوں کا ذکر کرتے ہوئے شیعیت سے بھی علمی بحث کی جاتی، کیوں کہ میرے خیال میں یہ وہ قوت ہے جو ہمارے درمیان رہ کر بھی سب سے بڑی مزاحمتی قوت اور فکر اسلامی کی راہ میں ضرر رساں اور روڑا رہی ہے، تاریخی تسلسل اور عصری مشاہدات یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس مزاحم قوت کو فکر اسلامی کا غلبہ قطعا منظور نہیں بلکہ سلطنت فارس کی عظمت وسطوت کی تشکیل جدید اسکی منشاء ہے، آں محترم نے روایتی مذہبیت کے ضمن میں اس جانب بڑا لطیف اشارہ کیا ہے جبکہ یہ موضوع بڑی تفصیل کا طالب ہے، یہ بحث مصنف کی جزئی اختلاف کے ساتھ بڑی دلچسپ اور مبنی بر حقیقت ہے اور واقعی دعوت فکر وعمل دیتی ہے، باوجود اس کے کہ اس کی ابتدائی سطریں اپنے ابہام وغموض کے سبب منفی فکر کی حامل نظر آتی ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس روایت پرستی کا آں محترم نے ذکر کیا ہے اس سے ہمارے ناقص مطالعہ ومشاہدے کی حد تک بہت کم لوگ ہی دامن بچا پاتے ہیں، ہماری مرجعیت کا محور صدی دو صدی کے اجتہادات ونظریات اور تحریکات کے بانیان ہی قرار پاتے ہیں، ان ہی کے نظریات کے دفاع و تعارض میں ہماری فکری توانائیاں ختم ہوجاتی ہیں، کاش کہ ان سے بچ بچا کر کبھی ہم فکر اسلامی کے حاملین اولین کو اپنے فکر ونظر کا موضوع بناتے اور بس وہیں سے روشنی حاصل کرتے اور اسی روشنی کو معیار بنا کر ماضی قریب کے مفکرین کے نظریات کو جانچتے اور پرکھتے تو شاید اس جماعتی عصبیت سے نجات مل جاتی جس کی طرف فاضل مصنف نے اشارہ کیا ہے۔

آخر میں کتاب کا خلاصہ درج ہے جس میں واقعی مصنف کی عرق ریزی اور مفکرانہ حس کا پتہ ملتا ہے، اس کا تعلق پڑھنے سے ہے، اس سے قوت تفکیر کو جلا ملتی ہے، غور وفکر کے نئے موضوعات سامنے آتے ہیں، قوت عمل کو تحریک ملتی ہے، اس خلاصہ میں مصنف نے بعض ان مفید پہلوؤں کی کمی کا بھی احساس رقم کیا ہے جو طوالت کے سبب سے شامل کتاب نہ کیے گئے یا کتاب کا مختصر حجم ان کا متحمل نہ ہوسکتا تھا، امید ہے آئندہ ایڈیشن میں وہ ضرور قابل قدر اضافہ کریں گے۔ مسک الختام کے طور پر ان کے یہ جملے پڑھتے چلیں ”آج اسلامی فکر کو روایت پسندانہ مجددانہ اور مصلحانہ افکار کے درمیان ایک خوبصورت توازن کے قیام کی بوجوہ ضرورت ہے اور یہی تطبیق

مستقبل میں فکر اسلامی کا محور ہوگی۔''

من حیث المجموع کتاب قابل قدر ولائق استفادہ اور اپنے موضوع پر بھرپور و مدلل ہے سوالات بھی قائم کرتی ہے، حلول بھی پیش کرتی ہے، امید ہے کہ اہل علم اس سے استفادہ کریں گے اور فکر ونظر کے مختلف پہلوؤں پر مواد کی تیاری کا یہ کتاب سبب بنے گی، کتاب میں پروف کی غلطیاں جا بجا اپنی جانب متوجہ کرتی رہیں، جو دور کمپیوٹری کی ایسی دین ہیں جس پر انسانی بس کم ہی چلتا ہے، مگر بہر حال کتاب ان اغلاط سے پاک ہوجائے گی تو اس کے حسن اور نکھر جائے گا۔

☆

نام کتاب: تجلیات قدسیہ ترجمہ جامع الاحادیث القدسیہ (۶ جلدیں)

صفحات: تقریباً پونے تین ہزار۔

ترجمہ و تشریح: مفتی محمد ثمین اشرف قاسمی

ناشر: ابراہیم لائبریری، مادھوپور، سلطانپور سیتامڑھی بہار۔

ملنے کے پتے: ابراہیم لائبریری وغیرہ

زیر نظر کتاب درحقیقت اللہ وحدہ لاشریک کے اس فرمان انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون کی ایک جیتی جاگتی تفسیر ہے، اللہ تعالیٰ نے جب قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ اپنے ذمہ لیا تو قرآن سے متعلق تمام چیزوں کی حفاظت بھی اس میں شامل ہوگئی، جو ''الذکر'' کی پنہائیوں اور وسعتوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے محدثین عظام کے ذریعہ ذخیرۂ احادث کی حفاظت کا کس طرح اہتمام کر دیا ہے، اگر اس کی تفصیل درج کی جائے تو بات طویل ہوجائے گی اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ کہ حدیث رسول ہی فہم قرآن اور شرح قرآن کا اولین وسیلہ ہے، احادیث کے بغیر فہم قرآن کا دعوی بے بنیاد ہے، چنانچہ ''الذکر'' کی حفاظت کے ساتھ قرآن کی اولین تفسیر حدیث رسول کی حفاظت ایک لازمی امر ہے، یہی نہیں اس حفاظت کے وعدہ میں وہ شخص وہ ادارہ اور وہ علم اور وہ زبان سب شامل ہوگئی جو قرآن کی نشر واشات اور قرآن کی حفاظت میں مصروف ہو، حدیث نبوی کی بابت قرآن مجید میں ارشاد ہے وأنزل الله عليك الكتب والحكمة وعلمك مالم تكن تعلم یہاں باتفاق مفسرین الحکمۃ سے مراد آپ کی سنت وتعلیمات ہیں، یہیں سے حضرات علماء نے وحی متلو وغیر متلو کی اصطلاحات کے تحت حدیث کو وحی غیر متلو قرار دیا ہے، وحی غیر متلو تفسیر وتشریح ہے وحی متلو کی، اس لیے وہ وحی متلو کی حفاظت کے وعدہ میں داخل ہے، اسی وعدۂ حفاظت کی تکمیل میں محدثین نے اپنی زندگیاں صرف کی ہیں، قابل مبارکباد ہیں مفتی محمد ثمین اشرف قاسمی صاحب کہ انہوں نے بھی اس خدمت کے ذریعہ اس علمی وعملی تحریک میں اپنا نام درج کرالیا، آج بھی ایسے ہزاروں افراد اس جہان رنگ وبو میں موجود ہیں جو ہر سمت سے رخ موڑ کر علوم دینیہ کی خدمت میں مصروف ہیں، ایسے لوگ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ ہر آن متقدمین کی اس علمی روایت کی امانت کو سینہ سے لگا کر آگے بڑھانے کا مبارک عمل انجام دے رہے ہیں، باوجود اس کے کہ یورپ علم وتحقیق کے نام پر نت نئی موشگافیوں کے ذریعہ اسلامی تعلیمات اور ذخیرۂ احادیث کے آہنی قلعہ میں قدغن لگانے کی ہر آن کوششیں کرتا رہتا ہے لیکن بحمد للہ آج تک ہر ہر قدم پر اسے منہ کی کھانی پڑی ہے۔

زیر نظر کتاب ''تجلیات قدسیہ'' درحقیقت مصری مصنف علامہ ابوعبدالرحمٰن عصام الدین صابطی مصری کی کتاب ''جامع الاحادیث القدسیہ'' کا مختصر تشریح کے ساتھ اردو ترجمہ ہے، علامہ مصری کی یہ کتاب تین جلدوں میں دارالریان للتراث، قاہرہ سے شائع ہوئی تھی جس میں تمام مطبوعہ احادیث قدسیہ کو جمع کر دیا گیا تھا، جن کی تعداد گیارہ سو پچاس ہے، اب مؤلف ومترجم محترم مفتی ثمین اشرف صاحب نے ان احادیث کو اردو

میں منتقل کر دیا ہے، کتاب ۶ جلدوں میں ہے، جلد اول میں ۱ تا ۲۰۳ حدیث ہیں، جلد دوم میں ۲۰۴ تا ۲۴۷ حدیث ہیں، جلد سوم میں ۳۴۸ تا ۵۴۲ اور جلد چہارم میں ۵۴۳ تا ۶۷۴ احادیث درج ہیں، جلد پنجم میں ۶۷۵ تا ۹۴۰ احادیث ہیں، آخری اور چھٹی جلد میں ۹۴۱ تا ۱۱۵۰ تک احادیث درج ہیں، کتاب کے آغاز میں متعدد تقریظات ہیں، خود مترجم صاحب نے ایک سادہ اور آسان زبان میں معلوماتی مقدمہ تحریر کیا ہے، کتاب ابواب میں تقسیم ہے اور پھر ہر باب میں درج روایت پر بھی مضمون حدیث سے مستفاد ایک عنوان قائم کر دیا گیا ہے، جس سے افادیت دوچند ہوگئی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ احادیث قدسیہ سے متعلق مترجم محترم کی یہ پہلی کتاب نہیں ہے، بلکہ اس سے قبل وہ شیخ محمد المدنی کی کتاب الاتحافات السنیۃ فی الاحادیث القدسیہ کا ترجمہ شائع کر چکے ہیں، ایک اور کتاب زیر طبع ہے جو مصر کی لجنۃ المجلس الاعلی للشوون الاسلامیہ سے شائع ہوئی ہے، اس کا نام الاحادیث القدسیہ ہے، مفتی صاحب نے اس کا ترجمہ نفحات قدسیہ کے نام سے کیا ہے، اس کے علاوہ بھی مفتی صاحب کے قلم سے متعدد کتابیں نکل کر مقبول عام ہو چکی ہیں، انہیں کئی باطنی نسبتیں بھی حاصل ہیں اور جس خاندان سے ان کا تعلق ہے ایسا لگتا ہے کہ علم دین کی آبیاری کے لئے قسام ازل کی طرف سے اسے وافر حصہ عطا ہوا ہے، ''حدیث قدسی'' سے ان کی دلچسپی بذات خود اس کی طرف ایک اشارہ ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ علماء کا عام خیال ہے کہ حدیث قدسی قلوب پر حدیث نبوی کے بالمقابل زیادہ اثر انداز ہوتی ہے، پھر اس سے کسے انکار کہ حدیث قدسی کو حدیث نبوی پر یک گونہ فضیلت حاصل ہے، یقیناً یہ ریاض حدیث کے وہ خوشنما اور مہکتے پھول ہیں جو مشام جاں کو معطر کرتے ہیں، جن کی پاکیزگی کی نسبت خود باری تعالیٰ کی پاک صفت ''قدوس'' کی طرف ہے، حدیث قدسی کہتے ہی ہیں اس روایت کو جو رسول اللہؐ نے حضرت جبرئیل کے واسطہ یا کبھی بذریعہ الہام ووحی یا خواب اللہ تعالیٰ سے روایت کی ہو، بڑے بڑے فضلاء ومحدثین نے ان سب کو نہیں تو کچھ کو ہی جمع کرنے کا التزام کیا ہے، اس ضمن میں بعض رسائل بہت مشہور ہیں۔

مترجم محترم نے اپنے مقدمہ میں بعض ضروری صراحتیں کر دی ہیں، ان کو یہاں دوہرانے کی ضرورت نہیں، البتہ یہ اشارہ ضروری ہے کہ یہ کتاب اردو زبان کے لیے بہترین ذخیرہ اور اردو دانوں کے لیے قیمتی تحفہ ہے، اس طرح کی کوئی ضخیم کتاب جو صرف احادیث قدسیہ کا مجموعہ ہو اردو کے ذخیرہ میں موجود نہیں تھی، کتاب بہر حال لحاظ عمدہ وقابل استفادہ بلکہ باعتبار مجموعہ احادیث قدسیہ کے ضخیم ذخیرہ افادات ہے اور ماشاء اللہ طباعت بھی شایان شان ہے، کیا خوب ہوتا جو ترجمہ وتشریح میں بھی معاصر اسلوب کی رعایت کی گئی ہوتی، اگر چہ بڑی حد تک زبان کو سہل رکھا گیا ہے مگر لفظی ترجمہ سے ثقل کا احساس ہوتا ہے۔

کتاب کے مختلف پہلوؤں پر تقریظات میں اظہار خیال کیا گیا ہے، ایک پیراگراف جو بحیثیت مجموعی کتاب کے افادی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے میں اس کو نقل کر کے گفتگو تمام کرتا ہوں: مفتی عارف باللہ القاسمی تحریر کرتے ہیں: ''درحقیقت یہ کتاب علماء، عوام اور بالخصوص دعوت وتربیت کا کام کرنے والوں نیز ائمہ وخطباء کے لیے ایک انمول تحفہ ہے، اور اس کے مطالعہ سے راہ حق کی پہچان، اس پر چلنے کا طریقہ، معرفت الٰہی اور قربت الٰہی کی اہمیت اجاگر ہوگی، اور ان پر یہ حقیقت واشگاف ہوگی کہ یہ کتاب صرف ایک شرح ہی نہیں بلکہ راہ سلوک کے راہی کا زاد راہ بھی ہے، اس طرح یہ کتاب شمع فروزاں بن کر لوگوں کے دلوں کو نور ایمان سے روشن کرے گی اور مؤلف کتاب محترم حضرت مفتی صاحب کے لئے ذخیرۂ آخرت بنے گی، انشاء اللہ۔''

صلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

☆☆☆

آخری صفحہ

ہندستانی مسلمانوں کا مستقبل

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے سابق صدر شعبۂ دینیات متکلم الاسلام اور سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے سامنے ایک مرتبہ ہندستان و پاکستان کے مسلمانوں کا تذکرہ آیا اور یہاں اور وہاں کے حالات پر حاضرین کی گفتگو ہوئی تو مولانا گیلانیؒ نے بڑے اعتماد کے ساتھ فرمایا کہ ہندستان کے مسلمانوں کا مستقبل روشن اور تابناک پاتا ہوں اور اس کی وضاحت میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک مرید کا لڑکا اسلامیہ اسکول میں زیر تعلیم تھا، اس کے باوجود اس کے عقائد و خیالات درست نہیں تھے، مرید نے حضرت مولانا سے اس کی شکایت کی، انہوں نے فرمایا کہ لڑکے کو اسلامیہ اسکول سے نکال کر کسی غیر مسلم اسکول میں داخل کردو، مرید نے ایسا ہی کیا، کچھ دنوں کے بعد مرید نے اطلاع دی کہ لڑکا اب پھر اسلام کی طرف مائل ہو رہا ہے حتی کہ کچھ دنوں بعد بالکل صحیح راستے پر آ گیا۔

مرید نے حضرت تھانویؒ سے پوچھا کہ یہ طریقۂ علاج سمجھ میں نہیں آیا! مولانا نے فرمایا کہ لڑکا جس ماحول میں تھا اس کے خلاف جانا پسند کرتا تھا اس لئے جب وہ غیر مسلم اسکول میں چلا آیا تو وہاں کے ماحول کے خلاف اسلامی شعار کی طرف مائل ہو گیا۔

مولانا گیلانیؒ نے اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ پاکستان کے مسلمان اپنے نئے ماحول میں کیا ہو جائیں گے وہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں پر نئے ماحول کا جو ردّ عمل ہوگا وہ میری نظر میں امید افزا ہے، ان میں مذہبی احساسات اور ملی جذبات کے بنا پر غیر شعوری طور سے پوری قوت مدافعت موجود ہے جو ہر زمانہ میں برقرار رہے گی جیسا کہ صدیوں سے رہی ہے۔ ہندوستان میں باہر سے جو قومیں آئیں وہ سب یہاں کی قوموں میں ضم ہو گئیں..... لیکن مسلمانوں نے اپنی انفرادیت باقی رکھی، ان کی مذہبی غیرت و حمیت میں بڑا استحکام ہے جو کمزور ہو سکتا ہے لیکن ختم نہیں ہو سکتا، اس پر کاری ضرب پڑ سکتی ہے لیکن کوئی اس کا استیصال کرنا چاہے تو یہ ممکن نہیں ہے؟

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی مذکورہ پیشین گوئی اور ہندستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں اس قیاس سے ممکن ہے بہت سے لوگوں کو اتفاق نہ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے وہ اکابرین جو ہندستان کو متحدہ قومیت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس نظریہ کے حامل تھے ان کی نگاہ بہت دوررس اور حقیقت شناس تھی، لیکن ہمارے وہ اکابر جو دو قومی نظریہ کے حامی اور مؤید تھے وہ بھی اپنی نیتوں، ارادوں اور جذبوں میں مخلص تھے وہ چاہتے تھے کہ ہندووانہ تہذیب اور مشرکانہ ماحول سے پاک مسلمانوں کو خالص اسلامی عقائد و تہذیب سے مزین اسلامی اسٹیٹ حاصل ہو جائے، جہاں مسلمان اسلامی شعار کے مطابق اور اس کے قوانین کے مطابق زندگی گزار سکیں، گویا وہ چاہتے تھے کہ پاسبان مل جائے کعبہ کو صنم خانے سے۔ لیکن اسلاف کے اس خواب کو بعد میں آنے والوں نے شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا جس کی کسک آج ہم سب محسوس کر رہے ہیں۔

(م۔ق۔ن)

(..... **بقیہ صفحہ نمبر ٤٦ کا**.....)

''فاتبعوا امر فرعون وما امر فرعون برشید، یقدم قومه یوم القیامةفاورد هم النار وبئس الورد المورود واتبعوا فی هذه لعنة ویوم القیا مة بئس الرفد المرفود'' (سورہ ہود ۹۷-۹۹)

پھر وہ فرعون کے کہنے میں چلے اور فرعون کی بات درست نہیں تھی وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے ہوگا، پس ان اکو آگ پر پہونچادے گا اور یہ پہونچنے کی بری جگہ ہے، اور پیچھے سے اس دنیا میں اس کو لعنت ملی، اور قیامت کے دن، یہ برا انعام ہے جو ملا۔'' (عالم عربی کا المیہ ص ۱۲۳۔۱۲۴)

آگے مزید صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

''اگر ہمارے اور آپ کے درمیان اسلامی عقیدہ کا اشتراک نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ ہمارا اور آپ کا انجام ایک ہے، اور ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے اور یہاں جو کچھ ہورہا ہے اس کا جواب ہم سے طلب کیا جاتا ہے تو شاید مجھے محاسبہ کا حق نہ ہوتا اور حقیقت تو یہ ہے کہ قومیں اسی محاسبہ ہی کے سہارے زندہ رہتی ہیں، یوروپی اقوام میں اگر اتنی بیداری اور مخلصانہ تنقید کا چلن نہ ہوتا تو وہ تاریخ ماضی کی کہانی بن چکی ہوتیں، کڑی تنقید ان کی زندگی کا ایک اہم سبب ہے، وہ اپنے کسی رہنما کو یہ موقع نہیں دیتیں کہ ہمیشہ اقتدار پر قابض رہے، اور اس کی تعظیم وتکریم ہوتی رہے، یہ صرف یوروپی اقوام ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ مسلمانوں کے سربراہ اور قائدین کی بھی یہی حالت تھی۔'' (عالم عربی کا المیہ ص ۱۲۶۔۱۲۷)

(..... **جاری**)

☆☆☆